عہدِ نبویؐ کا نظامِ تعلیم

ایک تاریخی و تحقیقی مطالعہ

غُلام عابد خان

ایم اے (تعلیم، تاریخ)

زاویہ پبلشرز

دربار مارکیٹ، لاہور

عہدِ نبویؐ کا نظامِ تعلیم

ایک تاریخی و تحقیقی مطالعہ

تصنیف

غُلام عابد خان

ایم اے (تعلیم، تاریخ)

زاویہ پبلشرز

(8-C محی الدین بلڈنگ) داتا دربار مارکیٹ، لاہور

فون: 042-7248657

موبائل: 0300-4505466 - 0300-9467047

Email:zaviapublishers@yahoo.com

2010ء

بار اول............................1000

84935

ہدیہ..................................200

زیرِ اهتمام........نجابت علی تارڑ

﴿لیگل ایڈوائزرز﴾

رائے صلاح الدین کھرل ایڈووکیٹ ہائی کورٹ (لاہور) 0300-7842176

محمد کامران حسن بھٹہ ایڈووکیٹ ہائی کورٹ (لاہور) 0300-8800339

﴿ملنے کے پتے﴾

علامہ فضل حق پبلیکیشنز، دربار مارکیٹ، لاہور 0300-4798782

کتب خانہ حاجی مشتاق احمد، بوہڑ گیٹ ملتان 061-4545486

رانل بک کمپنی، کمیٹی چوک، اقبال روڈ، راولپنڈی 051-5541452

انتساب

مرشدی و مولائی، شیخ طریقت، حضرت صاحبزادہ محمد عمر بیربلوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام جن کی نظر لطف و عنایت سے یہ ناچیز اس قابل ہوا۔

(مؤلف)

فہرست مضامین

عرض حال

زیر نظر کتاب اس ناچیز کی پہلی تالیف ہے جسے شائع ہوئے تقریباً تیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس کی پہلی طباعت کے ساتھ ہی مجھے اپنی معاشی سرگرمیوں کی بنا پر نہ صرف لاہور سے بلکہ صوبہ پنجاب سے بھی باہر جانا پڑا۔ اس وقت میں خود بھی مبتدی اور ناتجربہ کار تھا۔ اور میرا پبلشر بھی فٹ پاتھ پر پرانی کتابوں کا تاجر اور غیر معروف ناشر تھا۔ اور غالباً بطور پبلشر یہ اس کی پہلی اور آخری کتاب تھی۔ اس لیے اس وقت کتاب کی موزوں اور مناسب پبلسٹی نہ ہو سکی۔ اپنی طباعت اور ضخامت کے لحاظ سے بھی یہ کتاب کوئی اتنی دیدہ زیب نہیں تھی۔ اس لیے اس کی اشاعت نہایت محدود رہی۔ اس کے بعد بفضلہ تعالیٰ تالیف و تصنیف کے میدان میں مجھے اچھی کامیابیاں اور سعادتیں نصیب ہوئیں۔ جن کی تفصیل کا یہ محل نہیں۔ البتہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ میرا پہلا زینہ میری اگلی کامیابیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

ایک خوبصورت موضوع کے لباس میں 136 صفحات پر مشتمل یہ ... جو کچھ بھی تھی۔ اس کا اندازہ اس کے دیباچہ طبع اول (باعث تحریر ...) اور پروفیسر جناب منور ابن صادق صاحب کے مقدمہ کے مطالعہ سے بخوبی لگا جا سکتا ہے۔ اس لیے تعلیم و تعلم سے متعلق بعض حلقوں میں اس کی اچھی

پذیرائی ہوئی تھی۔ جس کا میں اپنے پروردگار کا از حد شکر گزار ہوں۔

یہ امر واقع ہے۔ کہ سیرۃ نبوی ﷺ کے اس پہلو پر کہیں کوئی زیادہ مواد میسر نہیں تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں جب اس کام کے لیے سیرۃ نبوی ﷺ کی مختلف کتابوں کا مطالعہ کر رہا تھا۔ تو خالصتاً تعلیم کے موضوع پر بہت کم مواد دیکھنے میں آیا۔ بلکہ ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم جیسے نامور سیرۃ نگار جنہوں نے اپنی بساط بھر سیرۃ نبوی ﷺ کا کوئی پہلو تشنہ تکمیل نہیں چھوڑا۔ ان کا صرف ایک مضمون "عہدِ رسالت کا نظامِ تعلیم" کسی اسلامی رسالے میں نظر سے گزرا تو قع ہوئی کہ شاید اس موضوع پر کچھ اور مواد مل جائے۔ لیکن جب کئی ایک اسلامی رسالے دیکھے تو ان میں بھی یہی مضمون چھپا پایا۔ تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے بھی اس موضوع پر اس سے زیادہ کچھ نہیں لکھا۔ بہر حال میں نے جو کچھ دیکھا اسے اپنے انداز میں اس خوبصورت موضوع کے تحت جمع کر دیا۔ اور کتاب شائع ہوگئی۔ اس کے بعد میری ایسی سرگرمیوں کا میدان بدل گیا۔ اور اس کتاب کی دوبارہ اشاعت کی توقع خواہش کے باوجود پوری نہ ہو سکی۔ البتہ اس کی پہلی اشاعت کے بعد چند ایک ایسے واقعات رونما ہوئے جن کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔

(1) کتاب کی اشاعت کے ایک سال بعد مجھے لاہور جانے کا اتفاق ہوا تو میں اپنے پبلشر سے ملنے اس کی دکان پر گیا۔ وہاں ایک استاد صاحب سے ملاقات ہوئی جو غالباً سیالکوٹ سے تشریف لائے تھے۔ تعارف ہوا تو وہ کہنے لگے۔ کہ آپ کی کتاب پر "روزنامہ نوائے وقت" میں تبصرہ پڑھا تھا جو بہت پسند آیا۔ تبصرہ نگار نے لکھا تھا۔ کہ "اس کتاب کا ہر عنوان بذات

خود ایک مقالہ ہے۔ اس لیے وہ کتاب خریدنے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔

(2) میں اس زمانے لاہور کینٹ میں فیڈرل گورنمنٹ کے سکول میں معلم تھا۔ اور ہمارے ایف۔جی سکولز کا ڈائریکٹریٹ اسلام آباد میں تھا۔ میرے صدر معلم کا تعلق ٹیچر یونین سے بھی تھا۔ اس لیے وہ اکثر اسلام آباد آتے جاتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ وہ مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ وہاں ڈائریکٹریٹ میں سید عاشق حسین شاہ صاحب اسٹنٹ ڈائریکٹر تھے۔ وہ بڑے تجربہ کار ہیڈ ماسٹر ہونے کے ساتھ اہل تشیع کے بڑے عالم اور نامور خطیب بھی تھے۔ متشرع چہرہ تھا۔ اس لیے کوئی پہچان نہیں سکتا تھا کہ موصوف شیعہ ہیں یا سنی۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا وسیع اور گہرا مطالعہ رکھتے تھے۔ اہل اعتدال میں سے تھے۔ اس لیے اہل سنت کے لوگ بھی انہیں اپنے اجلاسوں میں مدعو کیا کرتے تھے۔ ان سے تعارف ہوا تو میں نے اس کتاب کا ایک نسخہ انہیں پیش کیا۔ انہوں نے کتاب رکھ لی۔ ایک دو ماہ بعد انہیں ملنے کا پھر موقع ملا تو انہوں نے مجھے دیکھتے ہی گلے لگا لیا۔ اور فرمانے لگے کہ آپ کی کتاب نے میری لاج رکھ لی۔ فرمانے لگے کسی سیمینار میں مجھے اسلامی نظام تعلیم کے موضوع پر تقریر کی دعوت دی گئی۔ میں اس موضوع کے سلسلے میں بالکل کورا تھا۔ اور بڑا پریشان تھا۔ اتفاق سے گھر میں پڑی آپ کی کتاب ہاتھ لگ گئی اس کے مطالعے کے بعد میں نے اس موضوع پر ایسی تقریر کی کہ لوگ عش عش کر اٹھے۔

(3) مشہور ماہر نفسیات اور نامور سکالر ڈاکٹر عبدالرؤف صاحب جو غالباً

1978ء میں ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن پنجاب تعینات تھے کسی غیر معروف طریقے سے انہیں یہ کتاب پہنچی تو انہوں نے اپنے چند احباب کے سامنے اس کی بہت تعریف کی۔ اس محفل میں میرے جاننے والے بھی کچھ لوگ موجود تھے۔ جنہوں مجھے مطلع کیا۔ اتفاق سے I.E.R پنجاب یونیورسٹی میں کسی فنکشن کے موقع پر ان سے ملاقات ہوگئی۔ تو انہوں نے کتاب کی تعریف بھی کی اور ساتھ فرمایا کہ آپ نے اس کتاب میں بڑے اچھے نکات اٹھائے ہیں لیکن یہ کتاب بہت مختصر ہے۔ اگر اس موضوع پر اور کام کیا جائے تو مغرب والوں کے سامنے اس کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے آپ کوشش کریں کہ ان عنوانات کی مزید وضاحت کریں۔

(3) تقریباً اسی زمانے میں جناب پروفیسر بختیار حسین صدیقی صاحب سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور کے پرنسپل تھے جو خود بھی بڑے سکالر اور تعلیم کے موضوع پر کئی کتابوں کے مصنف تھے انہوں نے کسی سے ذکر کیا کہ کتاب بہت اچھی ہے اور مولف سے ملاقات کا اشتیاق بھی ظاہر کیا چنانچہ مجھے معلوم ہوا تو خود ان کے گھر پر حاضری دی۔ انہوں نے بڑی شفقت فرمائی اور کتاب کے متعلق بہت سی مفید تجاویز سے نوازا اور بڑی حوصلہ افزائی فرمائی۔

بایں ہمہ ان بزرگ ماہرین تعلیم کی رہنمائی اور توجہ دلانے کے باوجود میرے ذاتی حالات کچھ ایسے تھے۔ کہ میں اس کتاب پر دوبارہ کوئی کام نہ کر سکا۔ [illegible] اتفاق یہ کہ اس کتاب کی اپنی ذاتی کاپی بھی گنوا بیٹھا۔ حقیقت

یہ ہے کہ اب عمر کے جس حصے میں ہوں نہ وہ قویٰ ہیں نہ وہ صحت ہے۔ اور نہ وہ ذوق تحقیق باقی رہا ہے۔ ایسے حالات میں میں خود یہ گمان بھی نہ کر سکتا تھا۔ کہ کبھی اس کتاب کو اول الذکر ماہرین کے ارشادات کی روشنی میں بھی وضاحت کے ساتھ نئی ترتیب دے سکوں گا۔

سچ پوچھئے تو یہ بھی ایک حادثہ ہے۔ اور ایسے حادثے تائید ایزدی کے ساتھ ہی رونما ہوتے ہیں۔ اس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ حضرت صاحبزادہ خالد سیف اللہ صاحب مدظلہ العالی کو چند ماہ قبل ادارہ تصوف کے دوبارہ احیاء کا خیال دامن گیر ہوا۔ تو آپ نے اس کی تشکیل نو کے لیے لاہور میں اپنے احباب کے کئی اجلاس بلائے جس میں ادارۂ تصوف کو دوسری باتوں کے علاوہ کمرشل بنیادوں پر چلانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اور یہ بھی فیصلہ ہوا کہ ترجمان حقیقت محبوب الٰہی، مرشدہ ومولائی حضرت صاحبزادہ محمد عمر صاحب بیربلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریروں کی اشاعت کے ساتھ ساتھ دوسرے مصنفین کی کتابیں بھی شائع کی جائیں۔ چنانچہ میری اس کتاب کی اشاعت کی ذمہ داری بھی ادارہ تصوف کے منتظمین نے قبول کی۔ اور مجھے حکم ملا تو میں نے اس نایاب کتاب کی فوٹو کاپی آئی۔ ای۔ آر پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری سے حاصل کر کے جناب نجابت علی تارڑ صاحب (زاویہ پبلشرز) کو پیش کر دی۔ انہوں نے جب اس کتاب کا جستہ جستہ مطالعہ کیا تو مجھے بتایا کہ

اتنے خوبصورت موضوع پر اتنی مختصر سی کتاب کچھ زیب نہیں دیتی اگر آپ کچھ کوشش کر کے اسے دوبارہ مرتب کریں تو ممکن ہے اس کی ضخامت بھی بڑھ جائے اور کئی نئی چیزیں بھی منظر عام پر آ جائیں۔

مجھے اپنی عمر، صحت اور تحقیق کی مشکلات کا بخوبی اندازہ تھا لیکن ان کے خلوص کے آگے کچھ کہہ نہ سکا۔ اور ان کے ایماء پر کتاب دوبارہ مرتب کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ اتفاق سے سیرۃ طیبہ پر تخلیقی ذہن کے حامل مصنفین کی چند کتابیں میسر آ گئیں جن کے مطالعہ کے بعد بعض ایسے عنوانات جو نہایت مختصر تھے ان کو دوبارہ مرتب کیا گیا ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ اس طرح اس کتاب کی افادیت میں اضافہ ہوگا۔

آج سے پچیس تیس سال پہلے جن ماہرین تعلیم نے میری حوصلہ افزائی کی تھی۔ اور اس موضوع کو نئے سرے سے تفصیل کے ساتھ مرتب کرنے کی جو تجویز دی تھی وہ کام میں اس وقت سرانجام نہیں دے سکا تھا۔ اب مشیت ایزدی سمجھ کر میں قدرے مطمئن ہوں کہ قدرت نے مجھ سے دوبارہ جو کام لیا ہے۔ اس میں بھی کچھ نہ کچھ ان بزرگوں کا حصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ امین۔

البتہ شکر گزاری کے زیادہ مستحق جناب نجابت علی تارڑ صاحب ہیں جو اس ''حادثہ'' کا محرک بنے۔ اور ان کے ایماء پر اس کو دوبارہ مرتب کرنے کی

توفیق نصیب ہوئی۔ اور انہوں نے اس کا جدید رجحانات کے تحت اپنی نگرانی میں طبع کرانے کی ذمہ داری قبول کی۔ اور ساتھ ساتھ میں جناب حضرت قبلہ صاحبزادہ خالد سیف اللہ صاحب مدظلہ کا بھی تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ادارۂ تصوف کی طرف سے اس کی اشاعت کی منظوری مرحمت فرمائی۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کو دارین کی سعادتیں نصیب فرمائے! آمین

آخر میں قارئین سے گذارش ہے۔ کہ وہ دعا فرمائیں کہ ایک نہایت اعلیٰ وارفع موضوع کے لباس میں چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ کا مجموعہ جو بارگاہ رسالت میں، ایک حقیر نذرانۂ عقیدت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں قبولیت کا شرف حاصل کرے اور اہل علم ودانش اور صاحبان درد دل میں بھی قبولیت عطا فرمائے۔ آمین

اور اگر اس میں کوئی سہو، لغزش یا کوتاہی رہ گئی ہو تو اس کی طرف توجہ دلائیں تاکہ اس کی اگلی اشاعت میں اس کو دور کیا جا سکے۔

لغاری۔ ضلع خوشاب — احقر العباد

5 اگست 2009ء — پروفیسر غلام عابد خان

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

باعث تحریر آنکہ

سیرت کے کسی بھی پہلو پر مجھ جیسے بے علم اور کم مایہ کا قلم اٹھانا چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ مگر یہ حقیری کاوش دراصل اس احساس کا عملی نتیجہ ہے۔ جو چند سال پہلے دوران تدریس استاد مکرم جناب پروفیسر ڈاکٹر دین محمد ملک صاحب مرحوم کی کلاس میں پیدا ہوا۔ جناب ملک صاحب مرحوم نے ایک سوال کے جواب میں بڑے تاسف سے فرمایا تھا۔ کہ:۔

''ہمارے ہاں کتابیں لکھنے کا رجحان بہت کم ہے۔''

اس وقت لاشعوری طور پر اپنے دل میں ارادہ قائم کر لیا کہ اگر حالات نے اجازت دی تو کچھ نہ کچھ ضرور لکھوں گا۔ اس احساس کے ساتھ جب آئی۔ای۔آر کے تعلیمی و تحقیقی ماحول سے واپس لوٹا تو عملی زندگی کے تھپیڑوں نے اس جذبہ کو بہت حد تک کم کر دیا۔ تاہم تعلیم کے متعلق مسلمانوں کے افکار کو جمع کرنے کا ارادہ بہر حال پختہ ہو گیا۔ اس ضمن میں جب عہد رسالت ﷺ کے تعلیمی ماحول کا مطالعہ کیا تو یہ اتنا بڑھ گیا کہ اس کو علیحدہ کتاب کی صورت دینا ناگزیر ہو گیا۔

اپنی علمی بے مائیگی کے سبب ابتدائی ماخذات کی بجائے ثانوی ذریعوں پر اکتفا کرتے ہوئے چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ کا مجموعہ ایک نہایت اعلیٰ وارفع عنوان کے تحت حاضر خدمت ہے۔ خدا معلوم کہ کس حد تک اس عنوان کے شایاں نبھا ہو سکا ہے۔ اس امر کا اندازہ کرنا آپ کا کام ہے۔ اس لیے ان خامیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کر کے ممنون فرمائیں جو کسی بھی انداز میں اس کتاب میں موجود ہیں۔ تاکہ آئندہ کسی ایسی کوشش میں ان کا اعادہ نہ ہو۔ بصورت دیگر اگر یہ کوشش پسند آئے تو حوصلہ افزائی کرنا نہ بھو لیئے گا۔

اس کتاب کو عہد نبوی ﷺ کی تعلیمی سرگرمیوں اور تبلیغی کوششوں کا تاریخی مطالعہ کہہ لیجئے۔ اس امید پر لکھی گئی ہے کہ یہ اسلامی نظام تعلیم کے مزاج کو سمجھنے، تعلیم و تعلم کے عمل میں خالصتہً اسلامی رویہ اختیار کرنے اور اسلامی نقطۂ نظر سے علم و فن کی اہمیت وافادیت کو سمجھنے میں کسی حد تک مفید ثابت ہو۔ اور اس کے ساتھ ساتھ بچوں کی تربیت کے عمل میں مسلمان والدین اور اساتذہ کو راہنمائی کا کام دے۔ اگر اس معیار پر یہ چند اوراق پوری اتریں تو سمجھ لیجئے کہ یہی اس کے لکھنے کا مقصد تھا۔

ہمارے ہاں تصنیف و تالیف کے میدان میں اترنے کے لیے ایک نووارد کو جن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ ان کے ذکر کا یہ محل نہیں۔ بس یوں سمجھ لیجئے کچھ آسان اور کچھ مشکل۔ البتہ تائید ایزدی کا ثمرہ ہے۔ کہ کتاب

آپ کے ہاتھ میں ہے ساری باتیں کنایۃً کرنا بھی مناسب نہیں۔ بلکہ قدرت کاملہ نے اس راہ میں جو اسباب پیدا فرمائے ان کا ذکر نہ کرنا ناشکری ہوگی۔اس لیے میں سب سے پہلے اپنے مخلص دوست اور مکرم استاد جناب منور ابن صادق صاحب کا شکر گزار ہوں کہ جن کی راہنمائی اور مفید مشوروں سے یہ کتاب مکمل ہوئی۔اور اس پر مستزاد یہ کہ آپ نے کمال مہربانی سے اپنی تدریسی اور تحریکی مصروفیات کے باوجود اس کتاب کا مقدمہ لکھا ہے۔علمی حلقوں میں مخلص مکرم جناب انجم رحمانی صاحب (اسسٹنٹ ڈائریکٹر لاہور میوزم) بھی شکریہ کے مستحق ہیں۔کہ مایوس لمحوں میں جن کی حوصلہ افزائیاں میرے لیے مشعل راہ بنیں۔ دینی حلقوں میں قاری غلام حیدر صاحب (مدرس شمشادیہ سکول) نے قرآنی آیات کی تصحیح فرمائی۔ جناب ولی محمد صاحب اور محمد حسین قریشی صاحب مرحوم جن کے دینی اور ملی جذبہ اور مخلصانہ عملی کوششوں سے یہ کتاب زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔ میں ان سب حضرات کا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔

آخر میں قارئین سے گزارش ہے۔کہ میرے حق میں دعا فرمائیں کہ میری یہ حقیر سی کوشش اللہ عزوجل اور اس کے رسول مقبول ﷺ کے ہاں شرف قبولیت پائے۔آمین۔

صدر بازار لاہور کینٹ

13/جون 1978ء

مقدمہ

از

پروفیسر منور ابن صادق ادارہ تعلیم و تحقیق جامعہ پنجاب لاہور

قیامِ پاکستان کے بعد یہ مسئلہ مسلسل ہمارے لیے ایک چیلنج بنا ہوا ہے۔ کہ ہم اپنے نظامِ تعلیم کو اپنی ملی تقاضوں کے مطابق کیسے تشکیل دیں۔ اس سلسلے میں سب سے اہم مسئلہ نظامِ تعلیم کی فکری اساس کا تھا لیکن خوش قسمتی سے پاکستان کے نظامِ تعلیم کی فکری اساس کا مسئلہ کبھی متنازعہ فیہ نہیں رہا۔ تحریک پاکستان کی روح اور اس کے تقاضوں کو سمجھنے والے لوگوں کے زیرِ اثر اسلام کو اساسی نظریۂ حیات کے طور سے مسلسل تسلیم کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ 1947ء کی پہلی تعلیمی کانفرنس ہی میں یہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ پاکستان کا نظامِ تعلیم اسلامی نظریۂ حیات پر تشکیل کیا جائے گا۔ اس کے بعد کی تعلیمی دستاویزات میں بھی تغیرات کے ساتھ اس عہد کا اعادہ کیا جاتا رہا لیکن بد قسمتی سے آج بھی نظامِ تعلیم کے عملی ڈھانچے پر نظر ڈالی جائے تو بحیثیت مجموعی پورا نظام سیکولر نظر آتا ہے۔

المیہ یہ ہے کہ ہم اپنے نظامِ تعلیم کی اصلاح کے لیے یورپ اور امریکہ کی طرف دیکھتے ہیں۔ اور چند سال سے کچھ لوگ چین اور روس کی طرف

نظریں اٹھائے ہوئے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے۔

ترسم کہ بہ کعبہ نرسی اے اعرابی
کہ این راہ کہ تو میروی بتر کستان است

اسلامی نظریہ حیات کے دعوے کے بعد صحیح رویّہ یہ ہونا چاہیے تھا۔ کہ اپنے نظام تعلیم کی اصلاح اور تشکیل نو کے لیے اسوۂ رسول مقبول ﷺ کی طرف رجوع کیا جاتا کہ وہ عین ہدایت ہے۔ بقول اقبال:

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دین ہمہ اوست
گر باو نرسیدی تمام بو لہبی است

تعلیم کے شعبہ میں اسوۂ رسول ﷺ کا جائزہ ایک اہم قومی ضرورت تھی اور عزیز غلام عابد خان صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اپنے جذبۂ اخلاص اور شوق تحقیق کو یکجا کر کے اس اہم موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ دعا ہے۔ کہ نظام تعلیم کی تشکیل نو کے ذمے دار افراد اس تحقیقی کاوش سے استفادہ کرتے ہوئے ملک وملت کو صحیح نظام تعلیم سے مستفیض کر سکیں۔

اسوۂ رسالت مآب ﷺ کے سلسلے میں مسلمانوں کے اندر ایک ایسا طبقہ نمودار ہوا ہے جس کا موقف یہ ہے۔ کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے جو کچھ کہا اور جو کچھ کیا اس کی حیثیت ایک حاکم وقت کے فیصلوں کی سی ہے۔ جنہیں بعد کے لوگ بطور نظیر قبول بھی کر سکتے ہیں اور بدل بھی سکتے ہیں اس موقف کا خلاف اسلام ہونا واضح ہے لیکن اس موقف کی رو میں ایک دوسرا رجحان ابھرا

ہے اور وہ یہ ہے۔ کہ زندگی کے ہر نئے پرانے جزوی معاملے کے لیے اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سند لائی جائے۔ یہ رجحان معصومانہ ہونے کے باوجود اپنے اندر بعض خطرناک مضمرات رکھتا ہے جن کی ایک مثال یہ ہے۔ کہ اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی نظیر لے کر اسے کھینچ تان کر دور حاضر کے کسی ایسے معاملے پر فٹ کیا جاتا ہے۔ جو دراصل مباحات کے ذیل میں آتا ہے۔ اور اس وجہ سے اس کی اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سند لانا قطعاً ضروری نہیں ہے۔ جدید تحقیقات وترقیات کو اسلام کے مطابق یا اسلام کو ان کے مطابق ثابت کرنے کا رجحان اس کی دوسری مثال ہے۔ جس کے زیر اثر اقبال رحمۃ اللہ علیہ جیسا مفکر بھی پکار اٹھتا ہے۔

سبق ملا ہے معراج مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ بات ہمیشہ ذہن میں رہنی چاہیئے کہ اپنے منصب کے اعتبار سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن انسانی زندگی کے اخلاقی پہلو سے متعلق ہوتا ہے۔ جس کا موضوع بنیادی طور سے یہ ہے۔ کہ انسان کے لیے اپنے خالق اور دوسرے انسانوں کے ساتھ تعلقات کے سلسلہ میں کون سا رویہ درست ہے۔

بلاشبہ انسانی زندگی کے تمام شعبوں مثلاً تجارت، زراعت، صنعت و حرفت۔ سیاست۔ معیشت اور معاشرت میں رویے کے صحیح یا غلط کا سوال

پیدا ہوتا ہے۔ اور اسی حد تک زندگی کے تمام شعبے منصب رسالت کی حدود میں شامل ہیں۔ لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ان شعبون کے فنی اور تکنیکی پہلو نبی کے منصب کا حصہ نہیں بلکہ اس میں انسانی روابط کے آداب و اخلاق۔ قواعد وضوابط منصب نبوت کا موضوع ہوتے ہیں۔ کھجوروں کی پیوند کاری کا مشہور واقعہ اس کی ایک واضح مثال ہے۔ کہ نبی زراعت و باغبانی کے ٹکنیکل طریقے سکھانے نہیں آتا چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرما دیا کہ پیوند کاری کے متعلق آپ کی تجویز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی رائے تھی۔ اس کا تعلق تشریعی امور سے نہ تھا۔ اس طرح دوسرے شعبوں کے متعلق بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔ اور ایسے امور جن کے متعلق کوئی شرعی حکم نہ ملے انہیں مباحات کی ذیل میں رکھتے ہوئے جدید تحقیقات سے استفادہ کرنا عین ثواب ہوگا۔ اور انہیں لازماً اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم یا اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ان پر فٹ کرنا مناسب نہ ہو گا۔ شعبہ تعلیم میں بھی اسی اصول کا اطلاق ہوتا ہے۔

تعلیم وتزکیہ براہ راست رسالت کا حصہ ہے۔ قرآن حکیم نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض منصبی کے ضمن میں تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفوس کو نمایاں طور سے ذکر فرمایا ہے۔ خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو معلم قرار دیا اور حسن اخلاق کی تکمیل کو اپنے مقصد بعثت کا لازمی جز بیان فرمایا لیکن نظام تعلیم کے مختلف پہلوؤں کی جزئیات کو اسوہ مبارکہ میں تلاش کرنا مناسب نہیں۔ مثلاً سکول یا کالج کی عمارت کیسی ہو؟ ہوسٹل کا نقشہ کیا ہو؟ چاک بورڈ

کا رنگ کیا ہو؟ ان تمام امور کو تعلیمی پروگرام کے سلسلے میں غیر متعلق یا غیر اہم قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن ان میں سے کسی کے متعلق اگر اسوۂ رسول ﷺ سے کوئی نظیر نہ مل سکے۔ تو جدید تحقیقات سے اخذ و استفادہ اور مزید تحقیقات کے لیے عزم و ارادہ کی راہ ہر وقت کھلی ہے۔

اساتذہ اور طلبا کے لیے موزوں سہولیات کی فراہمی جدید دور کا ایک مسلمہ تعلیمی اصول ہے جہاں تک طلبا کے لیے سہولیات کا تعلق ہے۔ اس سلسلے میں تو ہمارے ہاں کوئی اختلاف نہیں۔ کہ یہ معاشرے کی ذمہ داری ہے۔ اس کے لیے صحاب صفہ علیہم السلام کی مثال دی جاتی ہے۔ کہ ان کی کفالت حکومت وقت کے ذمے تھی۔ لیکن جب اساتذہ کا معاملہ آتا ہے۔ تو بات بدل جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اساتذہ مشنری ہیں اس کا منصب پیغمبرانہ ہے۔ اور پیغمبر اپنے کام کا کوئی اجر نہیں لیا کرتا۔ حدیث رسول ﷺ سے شہادت لائی جاتی ہے کہ حضور ﷺ نے دینی خدمات پر معاوضہ لینے سے منع فرمایا ہے۔ بجا کہ معاوضے کے بغیر دینی خدمات انجام نہ دینے کو اصول بنا لینا خلاف اسلام ہے۔ مثلاً نماز کا وقت ہو اور کوئی شخص جماعت کرانے کے لیے آگے بڑھنے سے پہلے معاوضہ طے کرنے بیٹھ جائے یا کسی عالم دین سے شرعی مسئلہ دریافت کیا جائے تو وہ آجکل کے وکلاء کی طرح پہلے فیس طلب کرے تو یہ بات اسلام کے تبلیغی مزاج کی بالکل منافی ہے لیکن دینی خدمت کے لیے جب کسی کو باقاعدہ مامور کیا جائے گا۔ اور وہ اپنی معاش کو

چھوڑ کر اس کام میں لگے گا۔ تو اس کی معاش کی ذمہ داری آخر کس پر ہو گی؟ اسوۂ رسول ﷺ میں اس کا جواب موجود ہے۔ لیکن اسے دانستہ یا نادانستہ نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

اصحاب صفہ علیہم السلام کے متعلق سب کو تسلیم ہے کہ ان کی کفالت بالعموم حکومت کے ذمے تھی۔ لیکن یہ بات نظر انداز کر دی جاتی ہے کہ اصحاب صفہ علیہم السلام سب کے سب طلبہ ہی نہ تھے۔ ان میں اساتذہ بھی شامل تھے۔ آنحضور ﷺ کے تو سب شاگرد تھے۔ لیکن اس میں سے سینئر لوگوں سے معلّمی کی خدمت بھی لی جاتی تھی۔ مدینے سے باہر قبائل کی تعلیم و تبلیغ کے لیے اکثر اوقات انہی لوگوں کو بھیجا جاتا تھا۔ کہا جا سکتا ہے۔ کہ اصحاب صفہ مفلوک الحال لوگ تھے۔ لہٰذا اس نظیر کا اطلاق صاحب حیثیت معلمین پر نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلہ میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی مثال دی جا سکتی ہے' جو اصحاب صفہ میں سے نہیں تھے اور انہیں یمن بھیجا گیا تھا۔ وہ یمن میں آنحضور ﷺ کے گورنر بھی تھے۔ مبلغ بھی اور معلم بھی۔ کیا ان کی کفالت کی ذمہ داری حکومت پر نہ تھی؟ اسی طرح ہجرت مدینہ سے قبل بیعت عقبہ ثانیہ کے بعد آنحضور ﷺ نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ اور حضرت ام مکتوم رضی اللہ عنہا کو اہل مدینہ کی تعلیم کے لیے متعین کیا تھا۔ عین ممکن ہے کہ ان کی کفالت آنحضور ﷺ کی بجائے اہل مدینہ نے کی ہو، لیکن یہ بات خلاف قیاس ہے کہ یہ بزرگ اپنے خرچ پر اس فریضے پر مامور کیے گئے ہوں۔

تعلیم و معیشت کے باہمی تعلق پر آجکل بہت زور دیا جا رہا ہے جس کے نتیجہ میں رفتہ رفتہ "تعلیم برائے معاش" کا تصور غالب آ گیا ہے۔ کسی نہ کسی شکل میں فرد کو معاشی اعتبار سے معاشرہ کی پیداواری صلاحیت میں اضافے کے لیے تیار کرنے کا رجحان عام ہے۔ نصابات تعلیم میں ووکیشنل اور ٹیکنیکل ایجوکیشن میں مسلسل توسیع و تنوع اسی رجحان کا نتیجہ ہے۔ اور جدید نظام تعلیم ٹیکنیکل ایجوکیشن کے بغیر ناقص نظر آتا ہے۔ دوسری طرف زمانہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے نظام تعلیم پر نظر ڈالیں تو رسمی تعلیم میں ٹیکنیکل ایجوکیشن کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اس امر سے نہ تو یہ نتیجہ نکلنا درست ہے کہ زمانہ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کا نظام تعلیم ناقص تھا۔ اور نہ یہ کہ ٹیکنیکل ایجوکیشن کو نظام تعلیم میں شامل کرنا کوئی بدعت ہے۔ بلکہ اسے مباحات میں شامل سمجھنا چاہیے۔ جسے حالات زمانہ کی ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے منظم کرنا عین ثواب ہوگا۔

زمانہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے نظام تعلیم کے سلسلے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر جس معاشرہ کی اصلاح تھی اور جس کے لیے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نظام تعلیم کو وسیلہ بنانا چاہتے تھے اس کا اصل مسئلہ اخلاقی تھا، معاشی نہ تھا۔ بنیادی طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نظام تعلیم بالغاں کا نظام تھا، اور عملاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طلباء ضرورت زمانہ کے مطابق معاشی صلاحیت سے مسلح تھے۔ لہٰذا انفرادی اور اجتماعی دونوں اعتبار سے ٹیکنیکل ایجوکیشن اس دور کا

مسئلہ نہ تھا۔ مزید برآں اسلامی نقطۂ نظر سے تعلیم کا نصب العین ''معاد'' ہے ''معاش'' نہیں۔ لہٰذا اسلامی نظام تعلیم میں تعلیم کے اخلاقی پہلو کو بالا دستی حاصل ہونی چاہیئے۔ اور معاشی پہلو بقدر ضرورت ہونا چاہیئے۔ جس کا اصل مطمع نظر یہ ہے کہ مرد مسلمان دنیا میں راہبانہ نہیں بلکہ مجاہدانہ زندگی گزارنے۔ اور معاشرے پر بوجھ نہ بنے۔ چنانچہ اسوۂ رسول ﷺ میں محنت کی عظمت بڑے مؤثر پیرائے میں بیان کی گئی ہے، صدقہ وخیرات پر گزر اوقات کو کسر شان قرار دیا گیا ہے۔ اور اس کے مقابلے میں محنت مزدوری کے ذریعے کسبِ معاش کی ترغیب دی گئی ہے۔ اصحاب صفہ کی کفالت اگر چہ مجموعی طور سے حکومت کے ذمے تھی۔ لیکن ''درس گاہیں'' کے عنوان کے تحت زیر نظر کتاب میں نشان دہی کی گئی ہے۔ کہ اصحاب صفہ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لایا کرتے تھے۔ اور ان کو بیچ کر نہ صرف اپنی کفالت کرتے تھے۔ بلکہ اس میں سے صدقہ وخیرات بھی کیا کرتے تھے۔

تعلیم بالغاں اس دور کا بین الاقوامی مسئلہ ہے۔ اس ضمن میں اس دور ترقیات میں ماہرین کے ذہن کی پرواز کی عام سطح بالغوں میں خواندگی کے فروغ تک ہے۔ جس کی کل کائنات یہ ہے کہ انہیں پڑھنا، لکھنا اور معمولی حساب کتاب سکھا دیا جائے۔ اس کی ضرورت واہمیت سے انکار نہیں۔ لیکن اسے ''تعلیم'' کہنا درست نہیں ہوگا۔ چنانچہ اس کے لیے عام مروج اصطلاح ''لٹریسی'' یعنی خواندگی ہی کی ہے۔ اس کے مقابلے میں آنحضور ﷺ

کے دور پر نظر ڈالیں۔ تو آج سے چودہ سو 1400 سال قبل کا نیم وحشی معاشرہ، وسائل بے حد قلیل، بین الاقوامی خطرات کی یلغار اور مدنی دور کا دہ 10 سالہ مختصر عرصہ اور مختلف مذہبی۔ سیاسی، معاشرتی اور معاشی پس منظر رکھنے والے نوجوان، جوان، کہولت رسیدہ اور بوڑھے طلباء کی کثیر تعداد آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کے لیے صرف خواندگی ہی نہیں تعلیم کا انتظام کیا۔ ایسی بنیادی تعلیم جس میں عقائد و عبادات کے علاوہ آداب معاشرت اور معاملات کا معتد بہ حصہ شامل تھا۔ اور آجکل کی اصطلاح میں اسے اعلیٰ ثانوی تعلیم کہا جاسکتا ہے۔ ان تعلیم یافتہ عوام میں سے فقہاء و مجتہدین کی ایک اچھی خاصی تعداد تیار کی گئی ہے۔ آجکل کی اصطلاح میں اعلیٰ تعلیم بلکہ اختصاصی تعلیم کہا جا سکتا ہے۔ دور حاضر میں تعلیم بالغاں کے ماہرین اور منصوبہ بندوں کو رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کا تحقیقی نظر سے جائزہ لینا چاہیے اور اس قیمتی سرمائے سے کما حقہ، استفادہ کرنا چاہیے۔ زیر نظر کتاب کا موضوع اگرچہ تعلیم بالغاں نہیں۔ لیکن آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلیمی پروگرام میں تعلیم بالغان کو جو اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس کے پیش نظر زمانہ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے نظام تعلیم میں مختلف پہلوؤں کا جو تحقیقی جائزہ اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے وہ محققین تعلیم بالغاں کے لیے بے حد مفید ہوسکتا ہے۔

اس دور کا ایک اور اہم مسئلہ تعلیم نسواں ہے۔ اس وقت عورتیں تعلیم کے معاملے میں مردوں سے بہت پیچھے ہیں۔ مرد وزن کی مساوات مطلقہ کی آڑ

میں عورتوں کو مردوں جیسی تعلیم حاصل کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ اور یوں عملاً وہ دنیا کے تمام بزعم خود ترقی یافتہ ممالک میں تعلیمی اعتبار سے مردوں کی تابع مہمل بن کر رہ گئی ہیں۔ لیکن عورتوں کی تعلیم کے علیٰحدہ انتظام کی تجاویز کو رجعت پسندانہ قرار دیا جاتا ہے اور خواتین کے وجود کو محض تصویر کائنات کی رنگینیوں کا ایک ذریعہ سمجھنے والے مرد اور ہر میدان میں مردوں کے دوش بدوش زندگی کی دوڑ میں مسابقت کی مدعی خواتین فیشن کے طور پر ان تجاویز کی مخالفت میں پیش پیش نظر آتی ہیں۔ زیر نظر کتاب میں تعلیم نسواں کا جائزہ گو بڑا مجمل اور تحقیق مزید کا متقاضی ہے۔ لیکن اس سے یہ امر حتمی طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ اسوۂ رسول مقبول ﷺ خواتین کے لیے جداگانہ تعلیمی انتظامات کا تقاضا کرتا ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے خواتین کے لیے وعظ نصیحت اور درس و تدریس کے لیے مردوں سے علیٰحدہ ایک دن مختص کر رکھا تھا۔ مزید برآں مدینہ منورہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا درس علیٰحدہ خواتین کی یونیورسٹی کی حیثیت رکھتا تھا۔ آنحضور ﷺ کو خواتین کی جداگانہ تعلیمی ضرورتوں کا کس درجہ احساس تھا۔ اس کا اندازہ اس امر سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ ہجرت سے قبل بیعت عقبہ ثانیہ کے فوراً بعد آپ ﷺ نے اہل مدینہ کی تعلیم و تبلیغ کے لیے جن افراد کو متعین فرمایا تھا۔ ان میں بارہ مردوں کے علاوہ دو خواتین (حضرت ام عمارہ رضی اللہ عنہا، اور حضرت اسماء بنت عمرو رضی اللہ عنہا) بھی شامل تھیں۔

''درسگاہیں'' کے زیر عنوان مصنف نے زمانۂ رسالتمآب ﷺ کے

اہم تعلیمی مراکز کا تحقیقی جائزہ پیش کیا ہے۔ اور نظام تعلیم میں مسجد کی مرکزی حیثیت کی نشاندہی پیش کی ہے۔ مصنف کی تحقیق سے معلوم ہوا کہ عہد نبوی ﷺ میں صرف مدینہ کے اندر نو مساجد تھیں اور مضافاتی قبائل کی بیس 20 مساجد ان کے علاوہ تھیں۔ خواتین کے حلقہ ہائے درس علیحدہ تھے۔ جس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے درس کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ مدینہ منورہ کے علاوہ دیگر شہروں اور علاقوں میں مراکز تعلیم کا جائزہ شامل کتاب نہیں۔ لیکن مدینہ منورہ میں مراکز تعلیم کی تعداد سے مملکت اسلامیہ کے اس ابتدائی دور میں تعلیم گاہوں کے تعداد اور وسعت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ رائے درست معلوم نہیں ہوتی کہ دور رسالتمآب ﷺ صفہ کو تو اقامتی یونیورسٹی کی حیثیت حاصل تھی۔ لیکن اس کے علاوہ کسی رسمی درسگاہ کی نشاندہی مشکل ہے۔ ''رسمی درسگاہ'' کے جدید تصوّر کے مطابق تو شاید صفہ کو بھی یونیورسٹی کہنا مشکل ہو۔ لیکن درس گاہ کے تعلیمی پہلو کے اعتبار سے اس دور کی تمام مساجد درسگاہوں کی حیثیت رکھتی تھیں۔ البتہ مسجد نبوی ﷺ کی مرکزی حیثیت کی وجہ سے صفہ کو مرکزی درس گاہ کا درجہ حاصل تھا۔ اور اس کے مقابلے میں باقی مساجد ایسے تھیں جیسے کسی یونیورسٹی سے ملحق کالج ہوتے ہیں۔

''نصاب تعلیم'' پر مصنف کا جائزہ زیر نظر کتاب کی جان ہے، اس کے مطالعہ سے میرے علم میں بڑا اضافہ ہوا ہے۔ مصنف نے زمانہ رسالتمآب ﷺ کے نصاب تعلیم کی وسعت کی نشاندہی کر کے بہت بڑی

علمی خدمت انجام دی ہے۔ جدید ماہرین تعلیم نصاب کے روائتی اور جدید تصور کے حوالے سے اس کے احاطہ کار کے متعلق ابھی تک بحث وتمحیص کی سٹیج میں ہیں۔ لیکن آج سے چودہ سو سال قبل کے زمانہ میں جسے تاریخ تعلیم کے اعتبار سے بالکل ابتدائی زمانہ قرار دیا جائے گا۔ نصاب کی جامعیت کا یہ عالم تھا۔ کہ اسمیں دینی، دنیوی، نقلی اور عقلی علوم کے علاوہ، ہم نصابی مشاغل اور سرگرمیاں بھی شامل تھیں۔ عہد نبوی ﷺ میں تعلیم عامہ کے نصاب کا خاکہ کچھ یوں ہے۔

دینی علوم: قرآن، حدیث، فقہ، تجوید۔

عقلی ودنیوی علوم: ہیئت، انساب، ریاضی، طب۔

لغت وادب: عربی زبان وادب۔ غیر ملکی زبانیں بالخصوص عبرانی۔

فنون: خطاطی۔ اسلحہ سازی

ہم نصابی مشاغل: گھڑ سواری۔ گھڑ دوڑ۔ شتر دوڑ۔ پیراکی۔ نشانہ بازی۔ شعائر اسلامی کی پابندی ان کے علاوہ تھی۔ جس کی لازمی حیثیت شک وشبہ سے بالاتر ہے۔

آج کے ترقی یافتہ دور میں ثانوی اور اعلیٰ ثانوی سطح کے نصاب پر نظر ڈالیں اور پھر اس کے خاکہ کو ملاحظہ فرمائیں تو زمانہ رسالت مآب ﷺ کے اعلیٰ تعلیمی معیار اور اپنے دور کی بے بضاعتی کا شدید احساس ہوگا۔

کسی بھی نظام تعلیم میں اس کی فکری بنیادوں کو اہم ترین حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ زیر نظر کتاب کے مصنف نے اس اہم پہلو کو پیش نظر رکھا ہے۔

اور اپنے جائزہ کے بجا طور سے اسے اولیت حاصل ہے۔ اور بڑی خوبصورتی سے واضح کیا ہے کہ وحی الٰہی کے فکری سر چشمے سے حاصل شدہ توحید، رسالت۔ آخرت۔ خلافت۔ اخوت۔ حریت اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اساسی تصورات عہد نبوی ﷺ کے نظام تعلیم کے لیے فکری اساس کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان تصوّرات کی روشنی میں نظام تعلیم کا مطمع نظر ایسے معاشرہ کا قیام تھا۔ جس میں انسان دنیا و آخرت کی فلاح حاصل کر سکے۔

زیر نظر کتاب کا موضوع سیرۃ النبی ﷺ کا ایک خاص شعبہ ہے۔ تحقیقی کاوش ہے قطع نظر یہ امید ہے کہ ذکر محبوب ﷺ کا یہ انداز اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہو گا۔ اور مصنف کو اس پر اجر عظیم ملے گا۔ اللہ تعالیٰ اسے اہل علم و دانش اور صاحبان درد دل میں بھی قبولیت عطا فرمائے کہ اس میں مصنف کے ذوق تحقیق اور جذبۂ خدمت اسلام کی جھلک نمایاں ہے۔ ثانوی ذرائع سے ماخوذ ہونے کے باوجود نظام تعلیم کے جدید تصوّرات کے مطابق موضوعات کتاب کی پیش کش اور اسلوب کی ندرت نے تصنیف میں اوریجنلٹی پیدا کر دی ہے۔ قرآن وحدیث کا وسیع سرمایہ بہر حال مصنف کے ہونہار قلم کی جولانی کا مظہر ہے۔ اور ہم دعا گو ہیں کہ۔

اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

منور ابن صادق

لاہور 6، نومبر 1977ء

☆☆☆

پس منظر

بحیثیت مسلمان اسلام یا محمد رسول اللہ ﷺ کے پیغام اور تعلیم کے متعلق ہمارا دعویٰ ہے کہ وہ دنیا کی عظیم الشان روحانی۔ اخلاقی اور معاشرتی دعوت تھی تو اس بنا پر ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ ظہور اسلام سے پہلے دنیا کی عمومی حالت کیا تھی۔ اس وقت کی دنیا کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ وہ ایک ایسا کرۂ ارضی تھا جس پر آفتاب نہیں چمکتا تھا۔ تو بالکل بے جا ہوگا۔ کیونکہ تمام دنیا میں سچے اور صحیح عقیدہ کا کہیں وجود نہ تھا۔ توحید کی روشنی سے دنیا کا ذرہ ذرہ محروم تھا۔ اس وقت انسانی تہذیب کے مراکز یعنی مصر یونان اور روم میں سورج، چاند اور مختلف ستاروں اور سیاروں کی خدائی تھی۔ ان ہی کے معبد تھے۔ اور انہی کے ناموں پر بے گناہ انسانوں اور جانوروں کی قربانیاں دی جاتی تھیں۔ ہر جگہ پتھر کی مورتوں، مٹی کی صورتوں، سونے چاندی اور جواہرات کے بتوں کی پوجا کی جاتی تھی۔ عباس محمود العقاد مصری کے الفاظ ہیں:۔

> ”اس پر آشوب دور میں عالم انسانی کا نظام فکر و عمل درہم برہم ہو چکا تھا۔ معاشرہ کی اخلاقی اور رُوحانی قدریں دم توڑ چکی تھیں۔

> ہیئت اجتماعیہ کا سیاسی مزاج بگڑ چکا تھا۔ نسل آدم و حوا طبقاتی امتیازات کی تاریک غار میں محبوس ہو کر ایک تباہ کن ذہنی اور سیاسی خلفشار میں مبتلا ہو چکی تھی، بنی نوع انسان کے ظاہری و باطنی، روحانی اور مادی۔ ذہنی اور معاشی سکون و اطمینان کا سرمایہ لٹ چکا تھا۔ اور انسانیت کے پاس اضطراب، بےچینی، بے قراری اور حرماں نصیبی کے سوا کچھ باقی نہ بچا تھا۔(1)

دنیا کی یہ وہ عام حالت تھی جس میں سابقہ پیغمبروں علیہم السلام کی تعلیمات بلکہ عام انسانی قدروں تک کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ اس عمومی پس منظر کے بعد یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کی عظیم سلطنتوں اور تہذیب و تمدن کی دعویدار سیاسی جمیعتوں کا جائزہ لیا جائے، کہ ان کی درون خانہ حالت کیا تھی؟ اور جس تہذیب و ثقافت کے وہ امین تھے ان سے انسانیت کہاں تک بہرہ ور ہو رہی تھی؟ اس عہد کے تاریخی مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ایران اور روم میں اس وقت کی دو عظیم سیاسی طاقتیں تھیں۔ مذہبی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا جائے تو یہود اور ہنود دو قومیں قابل ذکر ہیں۔ سید سلیمان ندوی کے الفاظ میں:

> "اس وقت روئے زمین کی اہم طاقتیں فارس اور روم تھیں۔ فارس کا مذہب مجوسیت تھا۔ جس کا دائرہ عراق سے لے کر

(1) روزنامہ نوائے وقت، 14/مارچ 1976ء

ہندوستان کی سرحد تک محیط تھا۔ اور روم کا مذہب عیسوی تھا۔ جو
یورپ، ایشیا اور افریقہ کے تینوں براعظموں کو گھیرے ہوئے تھا۔
لیکن مذہبی حیثیت سے دو اور قومیں بھی قابل ذکر ہیں جن میں ہر
ایک کو اپنی قدامت کا دعویٰ تھا۔ وہ یہود اور ہندو تھے۔"(1)

فارس جو سیاسی لحاظ سے دنیا کی بہت بڑی طاقت اور مذہبی لحاظ سے مجوسیت کا پیرو کار تھا۔ اس کے روحانی اور اخلاقی انحطاط کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ:

"ایران میں بابلی تہذیب کے اثر سے ستارہ پرستی عام تھی۔ زرتشت نے کسی قدر اصلاح کا علم اٹھایا۔ لیکن بعد میں عیسائیت اور مجوسیت سے ایک ایسا مرکب تیار ہوا جس کے زیر اثر دنیا سے قطع تعلقی ترک ازدواج۔ باپ کا بیٹی اور بھائی کا بہن کو اپنی زوجیت میں لینا کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ پانچویں صدی عیسوی میں یزدگرد ثانی نے اپنی بیٹی سے نکاح کیا اور پھر اس کو قتل کروا ڈالا۔"(2)

اب روم کی حالت بھی ملاحظہ فرمائیے۔

"ملک کی عام سیاسی و اخلاقی حالت سے قطع نظر جب ہم مذہبی پہلو پہ نظر کرتے ہیں تو اس سے بھی زیادہ دل خراش تصویر سامنے آتی ہے۔

(1) سیرت النبی ﷺ جلد چہارم ص 13-212

(2) سیرت النبی ﷺ جلد چہارم ص 214

بت پرست رعایا کو چھوڑ کر جو ستاروں، دیوتاؤں اور بتوں کی پوجا میں بدستور مصروف تھی دوسرے لوگ جنہوں نے عیسائیت بھی قبول کر لی تھی وہ بھی باپ بیٹا اور روح القدس کی شخصیت اور مرتبہ کی تعین نے بیسیوں فرقے پیدا کر دیئے تھے۔ جس میں زبانی مناظروں سے گزر کر جنگ وجدال کی نوبت آئی تھی۔ یہاں تک کہ 514ء میں خود عیسائیوں کے دو گروہوں میں عظیم الشان جنگ لڑی گئی۔ جس میں پینسٹھ ہزار (65000) عیسائیوں کو فارغ البلد ہونا پڑا۔" (1)

اسی سلطنت روما کے بارے میں مختلف مغربی مورخین کی آراء کی مدد سے سید سلیمان ندوی اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ:

"تیسری صدی سے ساتویں صدی عیسوی تک مسیحت کی جو حالت رہی ہے وہ اس کے لیے باعث ننگ ہے۔ مشرکانہ رسوم نے مذہب کی جگہ لے لی تھی۔ اصل رومی بت پرستانہ عقیدوں نے مسیحی مذہب کا روپ دھار لیا تھا۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے ناسوتی اور لاہوتی دو عنصروں کی تحلیل مصر کو قابو رکھنے کے لیے کی گئی۔ ضعیف الاعتقادی بڑھ گئی اور ہر بڑے پادری سے اس کی وفات کے بعد دعا مانگی جاتی تھی۔ ملک شام میں جو بڑے پادری اور بطریق تھے۔ ان کے

(1) سیرت النبی ﷺ جلد چہارم ص 23-222

معتقدان کو سجدے کرتے تھے۔"(1)

اس عہد کا ہندوستان جو ایک متمدن ملک تھا۔ اور جہاں ایک با اثر مذہب قائم تھا۔ جس کے ارتقائی دور کی تاریخ طولانی ہے۔ جس کی ابتداء دو ہزار سال قبل مسیح علیہ السلام سے شروع ہوتی ہے۔ جس میں اصل ہندو اور ویدک، کوروؤں اور پانڈؤں کی جنگیں۔ عقلیت کا زمانہ۔ بودھ دور اور گوتم بدھ کی تعلیم تک شامل ہے۔ جو تقریباً ہندوستان میں مسلمانوں کے داخلہ تک قائم رہا۔ اس سارے عہد کا ماحصل اور نچوڑ یہ ہے کہ

"عورتیں جوئے میں ہاری جاتی تھیں۔ ایک عورت کے کئی شوہر ہوتے تھے۔ وہ بیوہ ہو کر زندگی کی ہر لذت سے عمر بھر کے لیے محروم کر دی جاتی تھی۔ اس لیے مرد کے مرنے کے بعد بعض عورتیں زندہ در آتش ہونا پسند کرتی تھیں۔ لڑائی میں شکست کے خوف سے خود اپنے باپ بھائی قتل کر دیئے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض فرقوں میں عورتیں مرد اور مرد عورتوں کو ننگا کر کے ان کی پوجا کرتے تھے۔ اور مذہبی تہواروں میں شراب پی کر ایسے بدمست ہوتے تھے کہ پھر انہیں ماں، بہن، بیٹی اور پرائی کی تمیز نہیں رہتی تھی۔ اور اس کو وہ نیکی کا کام سمجھتے تھے۔ شودروں کے نام سے ایک پوری قوم کی قوم ایسی غلامی میں مبتلا تھی کہ تعلیم و تربیت اور تہذیب و اخلاق اور

(1) سیرت النبی ﷺ جلد چہارم ص 225

دین وایمان سے محروم رہنا اس کا فرض تھا۔ وید کی آواز بھی ان کے کانوں میں پڑ جاتے تو اس میں سیسہ پگھلا کر ڈال دینے کا حکم تھا۔ راجاؤں کی بیویوں کی کوئی تعداد مقرر نہ تھی۔ قانون کی بنیاد مساوات انسانی پر نہیں بلکہ ذاتوں پر تھی۔ اور عورتیں فروخت کی جاتی تھیں۔(1)

اس عہد کی دنیا میں اگر یہ کہا جائے کہ یہود ایک ایسی قوم تھی جو موحد کہی جا سکتی ہے تو بجا ہوگا۔ دنیا کی آبادی اور اصلاح میں سب سے زیادہ امیدیں اسی قوم پر کی جا سکتی تھیں۔ لیکن حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے سام کی یہ اولاد جو سب سے پہلے وحی الٰہی کی امانت دار بنی۔ سخت جان ہونے کے ساتھ ساتھ سنگدل بھی ثابت ہوئی۔ اس قوم نے مختلف زمانوں میں اپنے پیغمبروں کو جھٹلایا۔ ان کو تکلیفیں دیں۔ بلکہ ان کو قتل کر ڈالا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بعد کوئی پیغمبر ایسا نہیں آیا جس نے ان کی سنگ دلی پر ماتم نہ کیا ہو اور ان کی سرکشی کے باعث ان کے حق میں بددعا نہ کی ہو۔ اس قوم نے تورات کی تعلیم میں تحریف کردی تھی اور اس کے قوانین کی اپنے حسب حال تاویلیں کرنے لگے تھے۔ آپس میں خوں ریزی، قتل و غارت کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ مال و دولت کے حرص کی وجہ سے ان میں ہر قسم کا لالچ، اور اخلاقی کمزوری پیدا ہوگئی تھی۔ سود خوری عام تھی۔ ان میں مشرکانہ بت پرستی کے بعض اثرات بھی پیدا ہوگئے تھے۔

(1) سیرت النبی ﷺ جلد چہارم ص 34-232

اوہام وخرافات پر ان کا ایمان تھا۔ تعویز۔ گنڈا۔ جادو اور عملیات پر فریفتہ تھے۔ عیسائیوں کی نقل میں وہ بھی حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے تھے۔ دولت اور ثروت پر بہت غرور کرتے تھے۔

جزیرۃ العرب کے وہ تینوں علاقے جو غیر ممالک کے پڑوس میں پڑتے تھے۔ ان کی سیاسی حالت سخت اضطراب وانتشار اور انتہائی زوال و انحطاط کا شکار تھی۔ انسان مالک وغلام، یا حاکم ومحکوم کے دو طبقوں میں بٹا ہوا تھا۔ سارے فوائد سربراہوں۔ اور خصوصاً غیر ملکی سربراہوں کو حاصل تھے۔ اور سارا بوجھ غلاموں کے سر تھا۔ اور زیادہ واضح الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ رعایا در حقیقت ایک کھیتی تھی۔ جو حکومت کے لیے محاصل اور آمدنی فراہم کرتی تھی۔ اور حکومتیں اسے لذتوں شہوتوں، عیش رانی اور ظلم وجور کے لیے استعمال کرتی تھیں۔ اور ان پر ہر طرف سے ظلم کی بارش ہو رہی تھی۔ مگر وہ صرف شکایت زبان پر نہ لا سکتے تھے۔ بلکہ ضروری تھا کہ طرح طرح کی ذلت ورسوائی اور ظلم اور چیرہ دستی برداشت کریں۔ اور زبان بند رکھیں۔ کیونکہ جبر واستبداد کی حکمرانی تھی۔ اور انسانی حقوق جیسی کسی چیز کا کہیں وجود نہ تھا۔ ان علاقوں کے پڑوس میں رہنے والے قبائل تذبذب کا شکار تھے۔ انہیں اپنی اغراض وخواہشات ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر پھٹکتیں رہتی تھیں۔ کبھی وہ عراقیوں کے ہم نوا ہو جاتے اور کبھی شامیوں کے ہاں میں ہاں ملاتے تھے۔

جو قبائل اندرون عرب آباد تھے۔ ان کے بھی جوڑ ڈھیلے اور شیرازہ

منتشر تھا۔ ہر طرف قبائلی جھگڑوں نسلی فسادات اور مذہبی اختلافات کی گرم بازاری تھی۔ جس میں ہر قبیلے کے افراد ہر صورت اپنے قبیلے کا ساتھ دیتے تھی۔ خواہ وہ حق پر ہو یا باطن پر۔ چنانچہ ان کا ترجمان کہتا ہے:

مَاأنَا اِلَّا مِنْ غَزِيَةٍ اِنْ غَوَتُ
غَوَيْتُ وَاِنْ تَرْشُدْغَزِيَةُ اَرْشُدِ

ترجمہ: میں بھی تو قبیلہ غزیہ کا ایک فرد ہوں۔ اگر وہ غلط راہ پر چلے گا تو میں بھی غلط راہ پر چلوں گا۔ اگر وہ صحیح راہ پر چلے گا تو میں بھی صحیح راہ پر چلوں گا۔

اندرون عرب کوئی بادشاہ نہ تھا جو ان کی آواز پر کان دھرتا۔ اور نہ کوئی مرجع ہی تھا۔ جس کی طرف مشکلات اور شدائد میں رجوع کیا جاتا۔ اور جس پر وقت پڑنے پر اعتماد کیا جاتا۔ ہاں حجاز کی حکومت کو قدر و احترام کی نگاہ سے یقیناً دیکھا جاتا اور اسے مرکز دین کا قائد اور پاسبان بھی تصور کیا جاتا تھا۔ یہ حکومت در حقیقت دنیوی قیادت اور دینی پیشوائی کا ایک معجون مرکب تھی۔ اسے اہل عرب پر دینی پیشوائی کے نام سے بالادستی حاصل تھی اور حرم اور اطرافِ حرم پر اس کی باقاعدہ حکمرانی تھی۔ دین زائرین حرم (بیت اللہ) کی ضروریات کا انتظام اور شریعت ابراہیمی علیہ السلام کے احکام کا نفاذ کرتی تھی اور اس کے پاس پارلیمانی اداروں جیسے ادارے اور تشکیلات بھی تھیں۔ لیکن یہ حکومت اتنی کمزور تھی۔ کہ اندرون عرب کی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کی طاقت نہ رکھتی تھی۔ جیسا کہ حبشیوں کے مکہ مکرمہ پر حملے کے موقع پر ظاہر ہوا۔(1)

(1) الرحیق المختوم۔ ص 55-56

اس عہد کی متمدن قوموں اور عظیم سلطنتوں کی یہ حالت تھی تو ظاہر ہے کہ عرب کی حالت کیا ہو گی۔ جہاں کوئی سیاسی وحدت موجود نہ تھی۔ بدوی اور قبائلی معاشرہ پر ظلمت کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ مکہ کو اگرچہ دین ابراہیمی علیہ السلام کی وجہ سے مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ لیکن ان کی تعلیمات کا بہت معمولی عنصر باقی تھا۔ عباس محمود العقاد کے تجزیہ کی مطابق:

> ''ملک کا مرکزی مقام مکہ دنیا کا قدیم ترین شہر تھا۔ یہ بستی بعض تضادات کا ایک عجیب وغریب مجموعہ تھی۔ ایک طرف خوشحالی۔ فارغ البالی۔ عیش وعشرت کی ہنگامہ آرائی۔ شراب وشاہد وشکر فروشی کی گرم بازاری تھی۔ تو دوسری طرف نکبت وافلاس غربت وبے مائیگی اور ضروریات زندگی سے محرومی کے مظاہر بھی موجود تھے۔ بیت اللہ کا وجود جہاں ایک روحانی قدر کی نشاندہی کرتا تھا وہاں دوسری طرف قمار بازی، بدکاری اور شراب نوشی کی قباحتیں برسر عام تھیں۔ ابراہیم علیہ السلام کی امت اور اسماعیل علیہ السلام کی چہیتی اولاد پیغام ابراہیمی علیہ اسلام کو بھلا کر شرک بت پرستی کی معصیت میں مبتلا ہو چکی تھی۔ مشترک اخلاقی اور روحانی نظریہ کے فقدان کے باعث یہ قوم دوراہے پر کھڑی تھی۔ وقت آ چکا تھا کہ حالات کی کوئی کروٹ اسے بلندیوں کی طرف اچھال دے یا ہمیشہ کے لیے ذلت وادبار کے گڑھے میں دھکیل دے۔''(1)

(1) عباس محمود العقاد المصری، آفتاب ہدایت۔'' روزنامہ نوائے وقت مورخہ 14 مارچ 1976۔

روم اور فارس کی دو عظیم عالمی طاقتوں اور ہندو اور یہود کی با اثر مذہبی قوموں کی صورت حال سے ہم بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس وقت دنیا کی تعلیمی حالت کیا ہو گی؟ رومی سلطنتیں اس وقت ایسی گروہ بندی کا شکار تھیں۔ کہ آپس میں مذہبی جدل و پیکار نے ان کی حالت ناگفتہ بہ کر دی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی تعصب اور رواداری کے فقدان سے وہاں کوئی تعلیمی نظام نہیں نہیں سکا ہو گا۔ پادریوں اور بادشاہوں کی مذہب اجارہ داری نے عوام تک تعلیم پہنچنے کی کب اجازت دی ہو گی۔ کلیسیاء جو اس عہد کے تعلیمی مرکز کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ اس کی حالت کا اندازہ بھی چنداں مشکل نہیں۔ اس کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ فارس اور روم کی مسلسل جنگوں نے دونوں ملکوں کو نہ صرف سیاسی اور اقتصادی لحاظ سے تباہ کیا۔ بلکہ اس کا براہ راست اثر تعلیم پر بھی پڑا ہو گا۔ اس عہد کے تاریخی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب اہل فارس رومی علاقوں کو فتح کرتے تو کلیساؤں کو ملیا میٹ کر دیتے تھے۔ اور اس طرح جب رومی فتح یاب ہوتی تو وہ ان کے آتش کدوں کو کلیساؤں میں تبدیل کر دیتے تھے۔ خاص کر سرحدی علاقے اس صورت حال سے زیادہ متاثر ہوتے تھے۔ دوسری بات جو ذہن میں ابھرتی ہے وہ یہ کہ تعلیم اس وقت صرف مذہبی راہنماؤں۔ بادشاہوں اور ان کے شہزادوں کی ضروریات میں شامل تھی۔ اور تعلیم جیسا کہ آجکل ہر معاشرہ میں ہر انسان کی بنیادی ضرورت سمجھی جاتی ہے۔ اس عہد میں اس قسم کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔

ایران کے اس دور کے تاریخی مطالعہ سے پتہ چلتا ہے۔کہ وہاں خالص جاگیرداری نظام رائج تھا۔شہنشاہ اور امراء ایسے عیاش تھے کہ عوام کی بھلائی اور بہبود کی ان کو کوئی فکر نہ تھی۔اس دور میں انسانیت کی جو قدر و منزلت تھی وہ بھی سطور بالا سے عیاں ہوتی ہے۔اس طرح ہندوؤں کی حالت بھی محتاج بیان نہیں۔ذات بات کی تقسیم اور برہمنوں کی مذہبی اور تعلیمی اجارہ داری اس بات کی کب اجازت دے سکتی تھی کہ وہاں کوئی عوامی علمی تحریک پیدا ہو سکے۔

اب رہی یہود کی بات تو وہ قوم اپنے مال و ثروت میں بدمست، اپنے آسمانی صحائف میں تحریف کی مجرم اور اخلاقی پستیوں کی حامل قوم جس کو کوئی سیاسی اور جغرافیائی وحدت نصیب نہ ہوئی ہو وہ کیونکر کسی ایسے تعلیمی نظام کی راہبری کر سکتی تھی۔جس میں عامۃ الناس کی بھلائی موجود ہو۔تاہم اپنی تاریخ سے والہانہ وابستگی اور عبرانی زبان سے محبت کے پیش نظر انہوں نے کچھ تعلیمی مدارس قائم کر رکھے تھے۔اور ان میں تورات اور انجیل کے عالم بھی موجود تھے۔جس کی وجہ سے انہیں عرب کی دوسری اقوام کے مقابلے میں تفوق حاصل تھا۔

مولانا صفی الرحمان مبارکپوری اس وقت جزیرہ العرب کی عمومی مذہبی حالت کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''جس وقت اسلام کا نیّر تاباں طلوع ہوا۔تو یہی مذاہب و ادیان تھے۔ جو عرب میں پائے جاتے تھے۔لیکن یہ سارے مذاہب شکست و ریخت کا

شکار تھے۔ مشرکین جن کا دعویٰ تھا کہ ہم دین ابراہیمی پر ہیں۔ شریعت ابراہیمی کے اوامر و نواہی سے کوسوں دور تھے۔ اس شریعت نے جن مکارم اخلاق کی تعلیم دی تھی۔ ان سے ان مشرکین کا کوئی واسطہ نہ تھا۔ ان میں گناہوں کی بھرمار تھی۔ طول زمانہ کے سبب ان میں بھی بت پرستی کی وہی عادات و رسوم پیدا ہو چکی تھیں جنہیں دینی خرافات کا درجہ حاصل تھا۔ ان عادات و رسوم نے ان کی اجتماعی، سیاسی اور دینی زندگی پر نہایت گہرے اثرات ڈالے تھے۔

یہودی مذہب کا حال یہ تھا۔ کہ وہ محض ریاکاری اور تحکم بن گیا تھا۔ یہودی پیشواء اللہ کی بجائے خود رب بن بیٹھے تھے۔ لوگوں پر اپنی مرضی چلاتے تھے۔ اور ان کے دلوں میں گذرنے والے خیالات اور ہونٹوں کی حرکات تک کا محاسبہ کرتے تھے۔ ان کی ساری توجہ اس بات پر مرکوز تھی۔ کہ کسی طرح مال و ریاست حاصل ہو، خواہ دین برباد ہی کیوں نہ ہو۔ اور کفر و الحاد کو فروغ ہی کیوں نہ حاصل ہو۔ اور ان تعلیمات کے ساتھ تساہل ہی کیوں نہ برتا جائے جن کی تقدیس کا اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو حکم دیا ہے۔ اور جن پر عمل درآمد کی ترغیب دی ہے۔

عیسائیت ایک ناقابل فہم بت پرستی بن گئی تھی اس نے اللہ اور انسان کو عجیب طرح سے غلط ملط کر دیا تھا۔ پھر جن عربوں نے اس دین کو اختیار کیا تھا۔ ان پر اس دین کا کوئی حقیقی اثر نہ تھا۔ کیونکہ اس کی تعلیمات ان کے مالوف طرز زندگی سے میل نہیں کھاتی۔ اور وہ اپنا طرز زندگی چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ باقی ادیان عرب

کے ماننے والوں کا حال مشرکین ہی جیسا تھا۔ کیونکہ ان کے دل یکساں تھے اور عقائد ایک سے تھے اور رسم ورواج میں ہم آہنگی تھی۔(1)

اس سارے تاریخی پس منظر اور اس کی روشنی میں لیے گئے جائزہ کا مقصد یہ تھا کہ بعثت نبوی ﷺ سے قبل دنیا میں ہمیں کسی ملک یا قوم میں کسی ایسی اصلاحی اور تعلیمی تحریک کا شائبہ تک نہیں ملتا۔ جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ تعلیم کو ہر انسان کی بنیادی ضرورت قرار دیا گیا ہو۔ اور علم اور ضرورت علم یا اس کی فضیلت کو آشکارا کر کے اس کے حصول کا اہتمام کیا گیا ہو۔ قاضی سلمان منصور پوری رحمۃ اللہ علیہ نے اس وقت کی تعلیمی حالت یوں بیان کی ہے:

"عرب نوشت وخواند سے معرّا اور مبرّا تھا۔ اور اسے اپنی اس حالت پر ناز بھی تھا لیکن یہودیوں اور عیسائیوں میں بھی تعلیم کا نام و نشان نہ تھا۔ جو تعلیم پادریوں میں پائی جاتی تھی وہ صرف بائیبل کے حروف سیکھنے تک محدود تھی۔ اس کے ساتھ ترجمہ وتفسیر شامل نہ تھے۔ یا ان بے سرو پا داستانوں کو علم کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ جو یہودیوں میں بطور کبھی ناول لکھی گئی تھیں۔ اور پھر ان کا درجہ وحی کے برابر تسلیم کر لیا گیا تھا۔ ہندوستان میں شریمد بھاگوت اور پرانوں کی حکومت تھی۔ بہت زیادہ ترقی کی صورت میں رامائن اور مہابھارت کے قصے منتہائے علم سمجھے جاتے تھے۔ یہی حال چین اور ایران کا تھا۔ یورپ بالکل جہالت کدہ تھا۔"(1)

(1) الرحیق المختوم۔ ص 67

(1) رحمۃ للعالمین جلد سوئم ص 402۔

اسلام......ایک ہمہ گیر انقلاب

محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت مصر۔ یونان۔ کلدانیا۔ اسیریا اور بابل کی عظمت افسانۂ پارینہ بن چکی تھی۔ خود عرب اور مضافات عرب میں جو نامور حکومتیں تھیں مدت گزری ان کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ انسانیت اخلاقی۔ روحانی اور سیاسی انحطاط کے باعث جس دوراہے پر کھڑی تھی جادہ منزل سے بے خبر دنیائے انسانی کے مذکورہ حالات اس بات کے شاہد تھے کہ انسانیت کی اس ڈانواں ڈول کشتی کو ساحل مراد تک پہنچانے کے لیے ایک نا خدا کی ضرورت تھی۔ دنیا ایک ایسے راہبر فرزانہ کی تلاش میں تھی جو اخلاقی اور روحانی پستیوں میں گری ہوئی انسانیت کو ظلمت کی اتھاہ گہرائیوں سے نکال کر عظمت انسان کی نشاۃ ثانیہ کا اہتمام کرے۔

مقتضائے عہد:

اگر کوئی سیاسی پیشن گو ساتویں صدی کے آغاز میں دنیا کا جائزہ لیتا تو اس نتیجہ پر پہنچتا کہ صرف چند صدیوں کی بات ہے۔ کہ پورا یورپ اور ایشیاء منگولوں کے زیر اقتدار آ جائے گا۔ مغربی یورپ میں نہ کوئی نظم تھا نہ کوئی اتحاد۔ رومی اور ایرانی حکومتیں ایک دوسرے کو تباہ کرنے پر لگی ہوئی تھیں ہندوستان

بھی منقسم اور ایسی صورت میں یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ پوری دنیا ایک عالمگیر فساد کی لپیٹ میں تھی۔ اس صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اپنی کتاب ''نبی رحمت ﷺ'' میں لکھتے ہیں۔

''عرض بعثت محمدی کے زمانہ میں پوری انسانیت خودکشی کے راستہ پر تیزی سے گامزن تھی انسان اپنے خالق اور مالک کو بھول چکا تھا۔ اور خود اپنے آپ کو اور اپنے مستقبل اور انجام کو فراموش کر چکا تھا۔ اس کے اندر بھلائی اور برائی اور زشت وخوب میں تمیز کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ انسان کے دماغ اور دل کسی چیز میں کھو چکے ہیں۔ انہیں دین اور آخرت کی طرف سر اٹھا کر دیکھنے کی بھی فرصت نہیں اور روح وقلب کی غذا، اخروی فلاح، انسانیت کی خدمت اور اصلاح حال کے لیے ان کے پاس کوئی ایک لمحہ خالی نہیں۔ بسا اوقات پورے پورے ملک میں ایک شخص ایسا نظر نہ آتا۔ جس کو اپنے دین کی فکر ہو۔ جو خدائے واحد کی پرستش کرتا ہو اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراتا ہو۔ جس کے جگر میں انسانیت کا درد ہو اور اس کے تاریک اور ہولناک انجام پر کچھ بے چینی ہو۔ یہ صورت حال اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی ہوبہو تصویر تھی۔'' (1)

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ

(1) نبی رحمت ﷺ ص۔45۔

لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۔ (الروم۔41)

ترجمہ۔ خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب فساد پھیل گیا ہے۔ تاکہ خدا ان کو ان کے عملوں کا مزہ چکھائے عجب نہیں کہ وہ باز آجائیں۔

"باشعور طبقہ صورت حال کی اس کم سوادی سے نالاں اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ مگر اصلاح کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو رہی تھی۔ جب کبھی چار ذی فہم سر جوڑ کر بیٹھتے اور عقیدہ و عمل کے بارے میں گفتگو چل نکلتی تو ہر کوئی قوم کی بے عملی اور اخلاقی انحطاط کا رونا روتا۔" (1)

مقتضائے وقت کی اہمیت کا وہ احساس جس کا ذکر کیا گیا ہے عباس محمود العقاد اس کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

"حالات کس چیز کے متقاضی تھے؟ دنیائے انسانی کو کس چیز کی ضرورت تھی؟ عرب قوم کے حالات کا مداوا کیا تھا؟ مکہ کی بستی اپنی مرکزی اہمیت کی وجہ سے ایک پیغمبر کی ضرورت محسوس کر رہی تھی۔ اور اس بستی کے ایک معزز گھرانے میں ایک ایسا بچہ تربیت پا رہا تھا۔ جس کی عظمت کے آثار نمایاں تھے۔ تہذیب انسانی کی تاریک فضاؤں کے ماحول میں عرب کے افق سے اسلام کا سورج 610ء میں نور ہدایت کے ساتھ طلوع ہوا۔ قریش مکہ کے ایک

(1) روزنامہ نوائے وقت مورخہ 13 مارچ 1976ء ص 1 ("آفتاب ہدایت" از عباس محمود العقاد مصری)

معزز گھرانے میں پرورش پانے والے محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نوع انسانی کو خدا تعالیٰ کا آخری پیغام یعنی دین اسلام دے کر تاریکی سے نکالا اور روشنی میں لا کھڑا کیا۔ کفر وضلالت اور گمراہی کی پستی سے نکال کر بلند کیا۔ ظلم سے نفرت دلا کر رحم وعدل کا خوگر بنایا۔ گناہ کاری اور سیاہ کاری سے بچا کر پرہیز گار بنایا۔ ایک خدائے وحدہ لا شریک کی عبادت کا درس دے کر منزل مقصود پر لگایا۔ حصول علم کو فرض قرار دے کر جہالت کے گڑھے سے نکالا۔ قانون خداوندی کا پابند کر کے انسان کو انسان کی زندگانی کا گر سکھایا۔ اخوت ومساوات کا سبق پڑھا کر انسانیت کی بکھری ہوئی عمرانی قوت کو یکجا کر دیا۔ اور سماجی انصاف قائم کر کے ظلم وستم کے پہاڑوں کو گرادیا۔ دنیا امن کا گہوارہ بن گئی۔ اور ہر طرف اس کائنات رنگ وبو میں نور خدا کی روشنی پھیل گئی۔'' (1)

(2) داعیِ انقلاب کی اکملیت اور جامعیت:

داعیِ انقلاب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جس قدر قلیل مدت میں دنیا کو امن کا گہوارہ بنایا اور پیغام خداوندی کو پھیلایا۔ اس کی مثال دنیا کی تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ تھوڑے ہی عرصے میں ریگستان عرب سے اٹھنے والے پیغام خداوندی نے قیصر وکسریٰ کے محلات کی اینٹ سے اینٹ بجا

(1) روزنامہ نوائے وقت مورخہ 14 مارچ 1976ء۔

دی۔ یہ تمام کامرانیاں کامیابیاں تائید ونصرت ایزدی اور بانی انقلاب کے اسوۂ حسنہ کی سحرافرینیاں ہیں۔ جن کے غیر بھی معترف ہیں۔ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں۔ کہ 1911ء میں بیروت کے ایک مسیحی اخبار ''اخبار الوطن'' نے لاکھوں عرب عیسائیوں کے سامنے یہ سوال پیش کیا تھا۔ کہ دنیا میں سب سے بڑا انسان کون ہے؟ اس کے جواب میں ایک عیسائی عالم (داور مجاعص) نے لکھا:

''دنیا میں سب سے بڑا انسان وہ ہے۔ جس نے دس 10 برس کے مختصر زمانہ میں ایک نئے مذہب، ایک نئے فلسفہ، ایک نئی شریعت اور ایک نئے تمدن کی بنیاد رکھی۔ جنگ کا قانون بدلا اور نئی قوم پیدا کی۔ اور ایک نئی طویل العمر سلطنت کی بنیاد رکھی۔ لیکن ان تمام کامیابیوں کے باوجود وہ امی اور ناخواندہ تھا۔ وہ کون! محمد بن عبداللہ ﷺ قریشی۔ عرب اور اسلام کا پیغمبر۔ اس پیغمبر نے اپنی عظیم الشان تحریک کی ہر ضرورت کو خود ہی پورا کیا۔ اور اپنی قوم اور اپنے پیروؤں کے لیے اور اس سلطنت کے لیے جس کو اس نے قائم کیا۔ ترقی اور دوام کے اسباب بھی خود مہیا کر دیئے۔ اس طرح کہ قرآن اور حدیث میں وہ تمام ہدایات موجود ہیں جن کی ضرورت ایک مسلمان کو اس کے دینی یا دنیاوی معاملات میں پیش آ سکتی ہے۔ حج کا ایک سالانہ اجتماع فرض قرار دیا تا کہ اقوام اسلامی میں اہل

استطاعت لوگ ایک جگہ جمع ہو کر اپنے دینی اور قومی معاملات میں باہم مشورے کر سکیں۔ اپنی امت پر زکوٰۃ فرض کر کے قوم کے غریب طبقہ کی حاجت پوری کی۔ قرآن کی زبان کو دنیا کی عالمی اور عالمگیر زبان بنا دیا کہ وہ مسلمانوں کے باہمی تعارف کا ذریعہ بن جائے۔ قوم کے ہر فرد کو ترقی کا موقع اس طرح عنایت کیا۔ کہ کہہ دیا کہ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان پر صرف تقویٰ کی بُنیاد پر بزرگی حاصل ہے اسی بناء پر اسلام ایک حقیقی جمہوریت بن گیا۔ جس کا رئیس قوم کی پسند سے منتخب ہوتا ہے۔ مسلمانوں نے ایک مدت تک اس اصول پر عمل کیا۔ یہ کہہ کر عرب کو عجم پر عجم کو عرب پر کوئی فضیلت نہیں۔ اسلام میں داخل ہونا ہر شخص کے لیے آسان کر دیا۔ غیر مسلموں کے لیے اسلامی ملکوں میں عیش و آرام اور امن و اطمینان سے سکونت کی ذمہ داری یہ کہہ کر اپنی اوپر لی کہ تمام مخلوق خدا کی اولاد ہے تو خدا کا سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو سب سے زیادہ اس کی اولاد کو فائدہ پہنچائے۔ خاندانی اور ازدواجی اصلاحات بھی اس سے پوشیدہ نہ رہیں۔ اس نے نکاح و وراثت کے احکام مقرر کیے۔ عورت کا مرتبہ بلند کیا۔ نزاعات اور مقدمات کے فیصلوں کے لیے قوانین بنائے۔ بیت المال کا نظام قائم کر کے قومی دولت کو بیکار نہ ہونے دیا۔ علم کی اشاعت اور تعلیم اس کی کوششوں کا

بڑا حصہ رہیں۔ اس نے حکمت کو ایک مومن کا گمشدہ مال قرار دیا۔
اسی سبب سے مسلمانوں نے اپنی ترقی کے زمانہ میں ہر دروازے
سے علم حاصل کیا۔ ان کارناموں کا حاملِ انسان دنیا کی سب سے
بڑی ہستی قرار نہ پائے گا؟" (1)

انسانی تاریخ کے اسٹیج پر کسی نامور شخصیتوں کے مثبت اور منفی کردار نمایاں ہیں جنہوں نے انسانی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کو متاثر کیا ہے۔ لیکن جملہ انسانیت کی فوز وفلاح اور ہمہ گیر تعمیر انسانیت کے لیے تاریخ انسانی سوائے داعیٔ انقلاب حضرت محمد ﷺ کے کوئی ایسی مثال پیش نہیں کر سکتی جس کی عملی زندگی جملہ پہلوؤں کو سمیٹے ہوئے نوع انسان کی سعادت وفلاح اور ہدایت کی ضامن ہو۔ اور نہ ہی تاریخ انسانی میں کوئی ایسا کثیر الاطراف کردار سامنے آتا ہے۔ جو ہمہ پہلو کفیل اور انسانیت کے لیے قابل تقلید ہو۔ سید سلیمان ندوی نے اس کا نہایت اچھوتے انداز میں جائزہ لیا ہے۔

"بہر حال تاریخ کی دنیا میں ہزاروں، لاکھوں اشخاص نمایاں ہیں۔ جنہوں نے آنے والوں کے لیے اپنی اپنی زندگیاں نمونہ کے طور پر پیش کی ہیں۔ ایک طرف شاہانِ عالم کے باشان و شوکت دربار ہیں۔ ایک طرف سپہ سالاروں کے جنگی پرے ہیں ایک طرف حکماء اور فلاسفہ کا متین گروہ ہے۔ ایک طرف فاتحین عالم کی پرجلال صفیں ہیں۔ ایک طرف خزانوں کے مالکوں کی بزم

(1) سیرت النبی ﷺ۔ جلد چہارم ص 400-401

گدیاں اور کھنکھناتی تجوریاں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی زندگی آدم کے بیٹوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ کارتھیج کا ہنیال۔ مقدونیہ کا سکندر۔ روم کا سیزر۔ ایران کا دارا۔ یورپ کا نپولین ہر ایک کی زندگی کشش رکھتی ہے۔ سقراط۔ افلاطون۔ ارسطو۔ دیو جانیس اور یونان کے دوسرے مشہور فلسفیوں سے لے کر سپنسر تک تمام حکماء اور فلاسفروں کی زندگیوں میں ایک خاص رنگ نمایاں ہے۔ نمرود و فرعون اور ابوجہل و ابولہب کی دوسری شخصیتیں ہیں قارون کی ایک الگ زندگی ہے۔ غرض دنیا کے اسٹیج پر ہزاروں قسم کی زندگیوں کے نمونے ہیں۔ جو بنی آدم کی عملی زندگی کے سامنے ہیں۔ لیکن بتاؤ! کہ ان مختلف اصناف انسانی میں سے کسی کی زندگی نوع انسان کی سعادت، فلاح و ہدایت کی ضامن اور کفیل اور اس کے لیے قابل تقلید نمونہ ہے۔" (1)

تاریخ انسانی کی ٹوہ میں تحقیق کے لیے جو بھی معیار مقرر کر لیا جائے خواہ وہ زمانہ کی تعین کو ہو۔ قوموں اور نسلوں کے عروج و زوال کی داستان ہو یا تاریخ کے دھارے موڑنے والی تحریکوں کا حال ہو۔ یا کسی عظیم لیڈر شپ کی اہلیت و قابلیت کا ہو۔ بہر حال کسی زاویے سے بھی دیکھا جائے تو ہمارے حضور پر نور ﷺ اس کا جواب ہیں۔ اس امر کا مولانا کوثر نیازی نے نہایت

(1) خطبات مدراس۔ ص 10-9۔

اچھوتے انداز میں جائزہ لیا ہے۔

"اگر انسان کی معیاد زندگی کو میعار بنالیا جائے تو چودہ سو 1400 سال کا عرصہ خاصا لمبا ہوگا۔ اس سے ذرا آگے قدم بڑھایا جائے اور قوموں کی زندگی کو میعار بنایا جائے تو یہ زیادہ سے زیادہ سوسوا سو نسلوں میں سمٹ جائے گا۔ اور اس کے بعد کا احساس بہت کم ہو جائے گا۔ لیکن اگر اس کو ایسی عصر ساز تحریکوں کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے۔ جو عالم انسانی کی فلاح و بہبود کے لیے جاری ہوئیں۔ اور جن کے اثرات نے انسانی تاریخ کے دھارے اس طرح موڑے کہ انسان موجودہ دور تک ترقی کی منزلیں طے کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ تو یہ طویل عرصہ کل کی بات معلوم ہوتا ہے اور آدمی حیرت زدہ ہو کر یہ سوچنے لگتا ہے کہ ایک فرد واحد کی آواز میں یہ اثر کیسے اور کیونکر پیدا ہوا کہ اس آواز نے نہایت قلیل عرصہ میں تاریخ کے متوقع راستوں کو بدل کر اس راستے پر ڈال دیا ہے کہ اس کی تاریخ کی کوکھ سے مشتری شکار دور جنم لے سکے۔"(1)

تاریخ ہمیں کسی ایسے قابل تقلید کردار یا کسی مذہبی یا اصلاحی تحریک سے متعارف نہیں کراتی جس میں انسانی زندگی کے سارے پہلوؤں کی اصلاح و تربیت کا سامان موجود ہو انسانیت کی فوز و فلاخ کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کردار اس لیے بھی کفیل اور ضمانت ہے۔ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم صرف کلیات

(1) ماہنامہ فکر و نظر "سیرت نمبر" مارچ 1976ء ص 21۔

تک محدود نہیں بلکہ اس میں زندگی کے ان جزویات کے لیے بھی رہنما اصول موجود ہیں۔ جن کو مخالفین تضحیک کا سامان خیال کرتے ہیں۔

حضرت سلیمان فارسی رضی اللہ عنہ سے مضحکہ خیز انداز میں مشرکین مکہ سوال کرتے ہیں کہ سنا ہے کہ تمہارے پیغمبر ﷺ ہر چیز کی تعلیم دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ قضائے حاجت کیونکر کرنی چاہیئے؟ حضرت سلیمان رضی اللہ عنہ نہایت اعتماد کے ساتھ جواب دیتے ہیں کہ:

> ''ہاں یہ بالکل سچ ہے۔ آپ ﷺ نے ہم کو حکم دیا ہے کہ ہم ایسی حالت میں قبلہ رخ نہ بیٹھیں۔ نہ اپنے داہنے ہاتھ سے طہارت کریں اور نہ تین ڈھیلوں سے کم استعمال کریں۔ جن میں کوئی ہڈی اور گوبر نہ ہو۔''(1)

اسلام کی تعلیمات کی ہمہ گیری کا اندازہ اس واقع سے ہو گیا ہو گا کہ زندگی کے نہایت ہی معمولی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ اس امر کی مزید وضاحت کرتے ہوئے اور اسلام کی ہمہ گیر تعلیمات کا ذکر کرتے ہوئے سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

> ''عرب کے بدوؤں اور قریش کے رئیسوں دونوں کے لیے آپ ﷺ کی بعثت تھی۔ اس لیے آپ ﷺ کی تعلیمات میں پست کو بلند اور بلند کو بلند تر بنانے کی برابر ہدایات ہیں۔ آج یہی

(1) سیرت النبی ﷺ جلد چہارم ص۔402۔

چیز ہے کہ افریقہ کے وحشیوں میں اسلام اپنی تعلیمات کے ساتھ تنہا جاتا ہے۔ اور ان کو متمدن اور مہذب بنانے کے لیے مذہب سے باہر کسی تعلیم کی اس کو ضرورت پیش نہیں آئی لیکن عیسوی مذہب کے چند اخلاقیات کو چھوڑ کر جن کا ماخذ انجیل ہے۔ عقائد پادریوں کی کونسلوں سے دعائیں اور عبادات کلیساؤں کے حکمرانوں سے تہذیب و تمدن کی تعلیمات یورپ کے بے دینوں اور ملحدوں سے حاصل کرنی پڑتی ہیں۔ لیکن اسلام محمد رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کچھ نہیں۔ عقائد ہوں کہ عبادات اور دعائیں۔ اخلاق ہوں کہ آداب تمدن۔ خانگی معاملات ہوں یا لین دین کے کاروبار۔ انسانوں کے ساتھ معاملہ ہو یا خدا کے ساتھ سب کا ماخذ رسول اللہ ﷺ کی ہمہ گیر تعلیمات ہیں۔" (1)

اس طرح سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے داعی انقلاب حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے کامل، عالمگیر اور لافانی نقش حیات، آپ ﷺ کی جامعیت اور کاملیت اور تمام طبقات انسانی پر ہر ماحول اور ہر زمانہ یا ہر پیشہ اور ہر مشغلہ، غرض ہر قسم کے حالات، سطح اور معیار کے لیے آپ ﷺ کی کامل و جامع رہنمائی اور اسوۂ حسنہ کی نہایت موثر اور بلیغ انداز میں تشریح کی ہے وہ لکھتے ہیں۔

"ایک ایسی شخصی زندگی جو ہر طائفہ انسانی کے لیے ہر حالت میں انسان

(1) سیرت النبی ﷺ جلد چہارم ص۔403۔

کے مختلف مظاہر اور ہر قسم کے صحیح جذبات اور کامل اخلاق کا مجموعہ ہو۔ صرف حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت ہے۔ اگر تم دولت مند ہو۔ تو مکہ کے تاجر اور بحرین کے خزینہ دار کی تقلید کرو۔ اگر تم غریب ہو تو شعب ابی طالب کے قیدی اور مدینہ کے مہمان کی کیفیت سنو، اگر تم بادشاہ ہو تو سلطان عرب کا حال پڑھو۔ اگر تم محکوم ہو تو قریش کے محکوم کو ایک نظر دیکھو۔ اگر تم فاتح ہو تو بدر و حنین کے سپہ سالار پر نگاہ دوڑاؤ۔ اگر تم نے شکست کھائی ہے تو معرکہ احد سے عبرت حاصل کرو۔ اگر تم استاد اور معلم ہو تو صفہ کے درس گاہ کے معلم مقدس کو دیکھو۔ اگر تم شاگرد ہو تو روح الامین کے سامنے بیٹھنے والے پر نظر جماؤ۔ اگر تم واعظ اور ناصح ہو تو مسجد مدینہ کے منبر پر کھڑے ہونے والے کی باتیں سنو۔ اگر تم تنہائی اور بے کسی کے عالم میں حق کی منادی کا فرض انجام دینا چاہتے ہو تو مکہ کے بے یار و مددگار نبی ﷺ کا اسوۂ حسنہ تمہارے سامنے ہے۔ اگر تم حق کی نصرت کے بعد اپنے دشمنوں کو زیر اور اپنے مخالفوں کو کمزور بنا چکے ہو تو فاتح مکہ کا نظارہ کرو۔ اگر تم اپنے کاروبار اور دنیاوی جدوجہد کا نظم و نسق درست کرنا چاہتے ہو تو بنونضیر، خیبر اور فدک کی زمینوں کے مالک کے کاروبار اور نظم و نسق کو دیکھو۔ اگر یتیم ہو تو عبداللہ اور آمنہ کے جگر گوشہ کو نہ بھولو۔ اگر بچے ہو تو حلیمہ سعدیہ کے لاڈلے کو دیکھو۔ اگر تم جوان ہو تو مکے کے ایک چرواہے کی سیرت پڑھو اگر تم سفری کاروبار میں ہو تو بصریٰ کے کارواں کے سالار کی مثالیں ڈھونڈو۔ اگر تم

عدالت کے قاضی اور پنچائتیوں کے ثالث ہو تو کعبہ میں نور آفتاب سے پہلے داخل ہونے والے ثالث کو دیکھو جو حجر اسود کعبہ کے ایک گوشے میں کھڑا کر رہا ہے۔ مدینہ کی کچی مسجد کے صحن میں بیٹھنے والے منصف کو دیکھو جس کی نظر انصاف میں شاہ و گدا اور امیر اور غریب سب برابر تھے۔ اگر تم بیویوں کے شوہر تو خدیجہ رضی اللہ عنہا اور عائشہ رضی اللہ عنہا کے مقدس شوہر کی حیات پاک کا مطالعہ کرو۔ اگر تم اولاد والے ہو تو فاطمہ رضی اللہ عنہا کے باپ اور حسن رضی اللہ عنہ و حسین رضی اللہ عنہ کے نانا کا حال پوچھو۔ غرض تم جو کچھ بھی ہو۔ اور کسی حال میں بھی ہو تمہاری زندگی کے لیے نمونہ، تمہاری سیرت کی درستگی اور اصلاح کے لیے سامان، تمہارے ظلمت خانہ کے لیے ہدایت کا چراغ اور رہنمائی کا نور محمد ﷺ کی جامعیت کبریٰ کے خزانے میں ہر وقت اور ہر دم مل سکتا ہے اس لیے طبقات انسانی کے ہر طالب علم اور نور ایمانی کے ہر متلاشی کے لیے صرف محمد ﷺ کی سیرت ہدایت کا نمونہ اور نجات کا ذریعہ ہے جس کی نگاہ کے سامنے محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت ہے اس کے سامنے نوح علیہ السلام، ابراہیم علیہ السلام، ایوب علیہ السلام، یونس علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام و عیسیٰ علیہم والسلام کی سیرتیں موجود ہیں گویا تمام دوسرے انبیاء کی سیرتیں...... ایک ہی جنس کی اشیاء کی دوکانیں ہیں اور محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت اخلاص واعمال کی دنیا کا سب سے بڑا بازار ہے جہاں ہر جنس کے خریدار اور ہر شے کے طلب گار کے لیے بہترین سامان موجود ہے۔''(1)

(1) خطبات مدراس۔ص۔96تا98۔

(3) تمدن انسانی کی نئی ساخت:

چھٹی صدی عیسوی میں عالمگیر پیمانے پر پوری نوع انسانی کی جو کیفیت نظر آتی ہے۔ اس کا مختلف سیر نگاروں نے اپنے اپنے انداز میں مفصل ذکر کیا ہے۔ اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پوری انسانیت خودکشی پر نہ صرف آمادہ تھی بلکہ کمربستہ تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس منظر اور صورت حال کی جو تصویر کھینچی ہے۔ اس سے بہتر کوئی بڑے سے بڑا مصور، ادیب اور مورخ ایسی تصویر نہیں کھینچ سکتا۔ سورہ آل عمران میں ارشاد خداوندی ہے

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنتُمْ اَعْدَاءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَاَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِ اِخْوَانًا وَكُنتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنقَذَكُم مِّنْهَا۔ (آل عمران۔103)

ترجمہ: اور خدا کی اس مہربانی کو یاد کرو۔ جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی۔ اور تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی بن گئے۔ اور تم لوگ آگ کے کنارے تک پہنچ چکے تھے تو خدا نے تم کو اس سے بچا لیا۔

درحقیقت انسانیت کی کشتی کو سلامتی کے ساتھ پار لگانا ہی اس عہد کا اصل مسئلہ تھا۔ کیونکہ جب کوئی تمدن اپنی حدود سے تجاوز کر جاتا ہے، اور اس میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ تو قدرت خداوندی اس کو سزا دینے یا اس کے بگاڑ کو سنوارنے کے لیے نئے نئے نشتر اور نئے نئے جراح پیدا کرتی

ہے۔ بقول شاعر۔

کرتی ہے ملوکیت انداز جنوں پیدا

اللہ کے نشتر ہیں تیمور ہو یا چنگیز

زمانہ جاہلیت میں انسانی تمدن صرف بگڑا ہی نہیں تھا۔ بلکہ متعفن ہو گیا تھا۔ اس کو کسی انسان کی جان کی، کسی زخمی کی تڑپ، کسی مصیبت زدہ کی کراہ میں وہ مزہ آنے لگا تھا۔ جو جام وسبو اور دنیا کے لذیذ سے لذیذ کھانے اور خوش نما منظر میں نہیں آتا تھا۔ آپ روما کی تاریخ پڑھیں جس کی فتوحات، نظم ونسق اور قانون سازی اور تہذیب کے دنیا میں ڈنکے بجے۔ ایک یورپین مورخ لکھتے ہیں:

”اہل روما کے سب سے زیادہ دلچسپ، فرحت افزاء اور مست کر دینے والا نظارہ وہ تھا۔ جو باہم شمشیرزنی، یا خونخوار جانوروں کی لڑائی میں ہزیمت خوردہ اور مجروح شمشیرزن جانکنی کی تکلیف میں مبتلا ہوتا تھا۔ اور موت کے کرب میں آخری ہچکی لیتا اس وقت روما کے خوش باش اور زندہ دل تماشائی اس خوش کن منظر کو دیکھنے کے لیے ایک دوسرے پر گرتے پڑتے تھے اور پولیس کو بھی ان کو کنٹرول رکھنا مشکل ہوتا تھا۔“

پس اس دور جاہلیت کا اصل مسئلہ یہ تھا۔ کہ پوری انسانی زندگی اور تمدن کی چولیں اپنی جگہ سے ہٹ گئی تھیں۔ انسان انسان نہیں رہا تھا۔ اور

سچ پوچھیے تو انسانیت کا مقدمہ اپنے آخری مرحلہ میں خدا کی عدالت میں پیش تھا۔ اور انسان اس مقدمے میں اپنے خلاف گواہی دے چکا تھا۔ اس حالت میں خداوند قدوس نے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو مبعوث فرمایا اور ارشاد فرمایا:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (الانبیاء۔107)

ترجمہ: (اے محمد) ہم نے تم کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر ہی بھیجا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارا یہ دور بلکہ قیامت تک کا پورا دور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت، دعوت اور مساعی جمیلہ کے حساب میں شامل ہے۔ اس لیے آپ ﷺ کا پہلا کام یہ تھا۔ کہ آپ ﷺ اس تلوار کو جو نوع انسانی کے سر پر لٹک رہی تھی۔ اس کو ہٹا لیا۔ اور اس کو وہ تحائف عطا کیے جنہوں اس کو نئ زندگی، نیت حوصلہ، نئ طاقت، نئ عزت، اور نئ منزل عطا کی اور اس کی برکت سے انسانیت میں، تہذیب وتمدن، علم وفن، روحانیت و اخلاص اور تعمیر انسانیت کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اس سلسلے میں داعیٔ انقلاب نے تمدن انسانی کی نئ ساخت و برداخت کے لیے درج ذیل عطیوں سے نوازا ہے۔ جنہوں نے نوع انسانی کی ہدایت و اصلاح، تعمیر و ترقی میں بنیادی اور قائدانہ کردار ادا کیا۔ جن کی بدولت ایک نئ دنیا وجود میں آئی۔

(1) عقیدۂ توحید:

داعیٔ انقلاب محمد رسول اللہ ﷺ کا انسانیت پر سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ آپ ﷺ نے دنیا کو عقیدہ توحید کی نعمت عطا فرمائی۔ اس سے زیادہ انقلاب انگیز یا حیات بخش عہد آفریں اور معجزہ نما عقیدہ دنیا کو پہلے نہ کبھی ملا ہے اور نہ قیامت تک کبھی مل سکتا ہے۔ یہ انسان جس کو شاعری، فلسفہ اور سیاست میں بڑے بڑے دعوے ہیں اور جس نے قوموں اور ملکوں کو بار بار غلام بنایا۔ عناصر اربعہ پر اپنی حکومتیں قائم کیں۔ پتھروں میں پھول کھلائے اور پہاڑوں کے جگر کاٹ کر دریا بہائے۔ اور یہاں تک کہ کبھی کبھی خدائی کا دعویٰ بھی کیا۔ لیکن اس کا دوسرا رخ ملاحظہ فرمائیں تو کبھی اپنے سے زیادہ مجبور اور ذلیل، بے حس وحرکت، بے جان اور مردہ، بعض اوقات اپنی ساختہ و پرواختہ چیزوں کے سامنے جھکتا رہا۔ ان سے ڈرتا اور انکی خوشامد کرتا تھا۔ اس کی ضلالت اور گمراہی کی انتہا یہ تھی کہ پہاڑوں دریاؤں، درختوں۔ جانوروں اور ارواح وشیاطین اور مظاہر قدرت کے سامنے ہی نہیں بلکہ کیڑوں مکوڑوں کے سامنے سجدہ ریز ہوتا تھا۔ اور اس کی پوری زندگی انہیں سے خوف وامید میں بسر ہوتی تھی۔ جس کا نتیجہ بزدلی، ذہنی انتشار۔ توہم پرستی اور بے اعتمادی تھا۔

آپ ﷺ نے اس انسان کو ایسے خالص، سہیل الفہم اور حیات بخش عقیدہ توحید کی تعلیم دی جس سے وہ خدا کے سوا جو حقیقی خالق کائنات ہے ہر

ایک سے آزاد یا نڈر اور بے فکر ہو گیا۔ اس میں ایک نئی قوت، نیا حوصلہ، نئی شجاعت اور نئی وحدت پیدا ہوئی جب اس نے صرف خدا کو کارساز حقیقی، اور حاجت روائے مطلق اور نافع وضار سمجھنا شروع کیا تو اس نئی دریافت اور یافت سے اس کی زندگی میں انقلاب آ گیا اور اس کی دنیا بدل گئی۔ نتیجتاً وہ ہر قسم کی غلامی اور عبودیت اور ہر طرح کے بے جا خوف ورجاء اور ہر قسم کی تشتت وانتشار سے محفوظ ہو گیا۔ اور اس کو کثرت میں وحدت نظر آنے لگی۔ وہ اپنے آپ کو ساری مخلوق سے افضل دنیا کا سردار منتظم اور صرف خدا کا محکوم اور فرمانبردار سمجھنے لگا۔

جس سے انسان پہلی بار انسانی تمدن اور انسانی عظمت وشرف کے قیام سے بہرہ ور ہوا پہلے جس سے پوری دنیا محروم ہو چکی تھی۔ بعثت محمدی کے بعد ہر طرف عقیدہ توحید کی بازگشت سنائی دینے لگی۔ دنیا کے سارے فلسفوں اور افکار پر اس کا کم وبیش اثر بڑا۔ وہ بڑے بڑے مذاہب جن کے رگ وریشہ میں شرک اور تعدد الٰہہ کا عقیدہ رچ بس گیا تھا۔ خدائی وحدت اور اپنے مشرکانہ عقائد کی نئی نئی تاویلیں کرنے پر مجبور ہوئے۔

(2) وحدت انسانیت کا تصوّر:

اسلام کا دوسرا انقلاب آفرین اور عظیم احسان وحدت، انسانی کا وہ تصوّر ہے جو آپ ﷺ نے دنیا کو عطا کیا۔ انسان قوموں و برادریوں، ذات جاتی اور اعلیٰ اور ادنی طبقوں میں بٹا ہوا تھا۔ اور ان کے درمیان

انسانوں اور جانوروں، آقاؤں اور غلاموں اور عبد و معبود کا سا فرق تھا۔ وحدت و مساوات کا کوئی تصوّر نہ تھا۔ آپ ﷺ نے صدیوں بعد پہلی مرتبہ یہ انقلاب انگیز اور حیرت خیز اعلان فرمایا۔

ایھاالناس ان ربکم واحد وان اباکم واحد کلکم لادم و ادم من تراب، ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم، ولیس لعربی علی عجمی فضل الا بالتقویٰ(1)

ترجمہ: لوگوں تمہارا پروردگار ایک ہے۔ اور تمہارا باپ بھی ایک ہے تم سب اولاد آدم علیہ السلام ہو اور آدم علیہ السلام مٹی سے بنے تھے۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز وہ جو تم میں سب سے زیادہ پاک باز ہے۔ کسی عربی کو عجمی پر فضیلت نہیں مگر تقویٰ کی بنا پر۔

یہ وہ الفاظ ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے اپنے آخری حج میں ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عظیم مجمع میں ارشاد فرمائے۔ آج علم و فہم، اور فکر انسانی کے ارتقاء کی ان منزلوں نے جتنی ترقی کی ہے اسلام کی دعوت، اسلام معاشرہ کے قیام، مصلحتیں اور داعیان اسلام کی کوششوں سے جتنی منزلیں طے ہوئیں انہوں نے اس انقلاب انگیز اعلان کو روز مرہ کی حقیقت بنا دیا ہے۔ اقوام متحدہ کے سٹیج سے لے کر جس نے حقوق انسان کا

(1) کنزالعمال

منشور شائع کیا ہر جمہوریہ اور ہر ادارہ کی طرف سے انسانی حقوق اور مساوات انسانی کا جو اعلان کیا جا رہا ہے کوئی ان کو سن کر متعجب نہیں ہوتا۔ لیکن ایک زمانہ تھا۔ جب مختلف قوموں اور خاندانوں کے ما فوق البشر ہونے کا عقیدہ قائم تھا۔ اور بہت سی نسلوں اور خاندانوں کا سلسلہ نسب خدا سے اور سورج چاند سے ملایا جا رہا تھا۔ قرآن نے اس فضا اور اس ماحول میں اعلان کیا۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنٰكُم مِّنْ ذَكَرٍ وَّأُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوباً وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ ۔

(الحجرات۔13)

''لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تا کہ ایک دوسرے کو شناخت کرو۔ خدا کے نزدیک تم میں عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے۔''

(3) احترام آدمیت:

آپ ﷺ کی رحمت للعالمینی کا تیسرا مظہر اور نوع انسان پر عظیم احسان احترام انسانیت اور انسان کی قدر و قیمت کا وہ اسلامی تصوّر ہے جو آپ ﷺ کا عطیہ اور اسلام کا تحفہ ہے۔ اسلام کا ظہور جس زمانے میں ہوا۔ اس زمانے میں انسان سے زیادہ ذلیل کوئی نہیں تھا۔ انسانی وجود بالکل بے قیمت اور بے حقیقت ہو کر رہ گیا تھا۔ بعض اوقات پالتو جانور،

بعض مقدس حیوانات اور بعض درخت جن کے ساتھ بعض عقائد اور روایات وابستہ ہوگئی تھیں انسان سے کہیں زیادہ قیمتی، لائق احترام اور قابل حفاظت تھے۔ ان کے لیے بے تکلف انسانی جانیں لی جاسکتی تھیں۔ اور انسانوں کے خون اور گوشت کے چڑھاوے چڑھائے جاتے تھے۔ آپ ﷺ نے انسان کا پایہ اتنا بلند کیا کہ اس سے اوپر صرف خالق کائنات کی ہستی رہ جاتی ہے۔ قرآن نے اعلان کیا کہ وہ خلیفۃ اللہ (خدا کا نائب) ہے اور ساری دنیا اور یہ ساری کائنات اس کے لیے پیدا کی گئی ہے۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (البقرہ۔29)

ترجمہ: وہی ہے جس نے تمہارے لیے وہ سب کچھ پیدا کیا جو اس زمین پر ہے۔

اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کائنات کی تخلیق میں وہ خود شاہکار ہے وہ اشرف المخلوقات ہے اور اس بزم ہستی کا صدر نشیں وہی ہے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِيْ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلاً۔ (الاسرىٰ۔70)

ترجمہ: اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور ان کو جنگل اور دریا میں سواری اور پاکیزہ روزی عطا کی اور اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت بخشی۔

اس سے زیادہ اس کی عزت افزائی اور اس کی اہمیت کا اعتراف کیا ہو سکتا ہے کہ صاف کہہ دیا گیا کہ انسان خدا کا کنبہ ہے۔ اور خدا کو اپنے بندوں میں سب سے زیادہ وہ محبوب ہے جو اس کے کنبہ کے ساتھ اچھا سلوک کرے اور اس کو آرام پہنچائے۔

الخلق عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الیٰ عیالہ۔(1)

ایک سراپا توحید مذہب انسانیت کی بلندی اور انسان کی رفعت و محبوبیت کا اس سے بڑھ کر کیا اعتراف کیا جا سکتا ہے۔ کیا دنیا کے کسی فلسفے و مذہب میں انسان کو یہ مقام عطا کیا گیا ہے؟

(4) فطرت انسانی پر اعتماد کی بحالی:

بعثت محمدی کے وقت نوع انسانی کے اکثر افراد پر فطرت انسانی سے بدگمانی اور خدا کی رحمت سے مایوسی کی ایک عام فضا چھائی ہوئی تھی۔ اس ذہنی کیفیت کے پیدا کرنے میں ایشیاء کے بعض قدیم مذاہب اور مشرق وسطی اور یورپ کی تبدیل شدہ عیسائیت نے یکساں کردار ادا کیا تھا۔ ہندوستان کے قدیم مذاہب نے تناسخ ''اواگون'' کے فلسفہ کے ذریعے جس میں انسان کے ارادہ اور اختیار کو مطلق دخل نہیں ہے۔ اور جس کی رو سے ہر انسان کو اپنے پہلے جنم کے اعمال اور غلطیوں کی سزا بھگتنی ضروری

(1) مشکوۃ شریف بروایت بیہقی۔

ہے۔ اور عیسائیت نے انسان کے پیدائشی گنہگار اور اس کے لیے حضرت مسیح علیہ السلام کے کفارہ بننے کی ضرورت کے عقیدہ کے نتیجہ میں اس وقت کے متمدن دنیا کے لاکھوں کروڑوں افراد کو جوان مذاہب کی پیرو تھے اپنی ذات سے بدگمانی اپنے مستقبل اور خدا کی رحمت سے مایوسی میں مبتلا کر دیا تھا۔

محمد رسول اللہ ﷺ نے پوری طاقت وصفائی سے اعلان کیا۔ کہ انسان کی فطرت ایک سادہ تختی کی مانند ہے جس پر پہلے سے کوئی تحریر نہیں لکھی ہے۔ اس پر بہتر سے بہتر تحریر لکھی جا سکتی ہے۔ انسان اپنی زندگی کا خود آغاز کرتا ہے۔ اور اپنے اچھے یا برے عمل سے اپنی دنیا و عاقبت بناتا یا بگاڑتا ہے۔ وہ کسی دوسرے کا ذمہ دار یا جواب دہ نہیں ہے قرآن نے بار بار اعلان کیا کہ آخرت میں کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ اور یہ کہ اس کے حصے میں اسی کی کوشش اور اسی کے نتائج آنے والے ہیں۔ ہر انسان کی اپنی کوشش کا نتیجہ ظاہر ہوگا۔ اور اس کو اس کا بھرپور بدلہ ملے گا۔

أَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرَىٰ وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ ○ وَأَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرَىٰ ○ ثُمَّ يُجْزَاهُ الْجَزَاءَ الْأَوْفَىٰ ○ (النجم 38 تا 41)

ترجمہ: یہ کہ کوئی شخص دوسرے (کے گناہ) کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔ اور یہ کہ اس کی کوشش دیکھی جائے گی پھر اس کو اس کا پورا پورا بدلہ

دیا جائے گا۔

قرآن کے اس اعلان سے انسان کا اپنی فطرت اور اپنی فطری صلاحیتوں پہ وہ اعتماد بحال ہو گیا۔ جو پہلے بالکل متزلزل ہو گیا تھا۔ وہ نئے عزم و یقین اور نئے جوش و ولولہ کے ساتھ اپنی اور بنی نوع انسان کی تقدیر بدلنے اور اپنی قسمت اور قوت آزمانے کے لیے سرگرم عمل ہو گیا۔

داعیٔ انقلاب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے گناہوں۔ لغزشوں اور انسانی غلطیوں کو ایک عارضی حالت قرار دیا۔ جس میں انسان اپنی کوتاہ نظری اور نفس و شیطان کی ترغیب سے مبتلا ہو جاتا ہے۔ صلاحیت۔ خیر پسندی، اعتراف قصور اور ندامت اس کی فطرت کا اصل تقاضا اور انسانیت کا جوہر ہے۔ اپنی غلطی کا اعتراف کرنا خدا کے سامنے رو دھو کر اپنے قصور معاف کرا لینا اور آئندہ ایسی غلطی نہ کرنے کا عزم کرنا انسان کی شرافت اور آدم کی میراث ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں پر توبہ کا ایسا دروازہ کھولا اور اس کی زور شور سے تبلیغ فرمائی اس کے ایسے فضائل بیان فرمائے اور اس کا مرتبہ اتنا بلند کیا کہ وہ اعلیٰ درجہ کی عبادت اور خدا کے قرب اور اس کی محبوبیت کا ایسا ذریعہ بن گیا کہ اس سے بڑے بڑے معصوم صفت اور ناکردہ گناہ عابدوں اور زاہدوں کو رشک آنے لگا۔

ارشاد خداوندی ہے:

قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ

رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ (الزمر۔53)

ترجمہ: کہہ دیجئے اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنے حق میں زیادتی کی ہے۔ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ بے شک اللہ تعالیٰ تمام گناہ معاف کر دیتا ہے۔ بے شک وہ بڑا بخشنے والا اور بڑا رحم کرنے والا ہے۔

اسلام میں ''توبہ'' کی اہمیت اور فضیلت کس قدر ہے۔ کہ قرآن مجید میں ایک باقاعدہ سورۂ توبہ کے نام سے شامل کی گئی ہے اور اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے باعمل اور نیک سیرت بندوں کی جس نورانی فہرست کا ذکر کیا ہے۔ اس میں پہلے نمبر پر ''تائبوں'' کے نام کا ذکر کیا ہے۔

اَلتَّائِبُوْنَ الْعَابِدُوْنَ الْحَامِدُوْنَ السَّائِحُوْنَ الرَّاكِعُوْنَ السَّاجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحَافِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (التوبہ۔112)

ترجمہ: توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے۔ حمد کرنے والے، بے تعلق رہنے والے رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے نیک کاموں کا امر کرنے والے اور بری باتوں سے منع کرنے والے، خدا کی حدود کی حفاظت کرنے والے (یہی مومن لوگ) اور (اے پیغمبر ﷺ) مومنوں کو (بہشت) کی

خوشخبری سنا دو۔

اور پھر اسلام نے ایک اصول کے طور پر اس بات کا اعلان کیا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہر چیز پر حاوی اور اس کے غضب و جلال پر غالب ہے۔

وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (الاعراف۔156)

ترجمہ: میری رحمت ہر چیز پر حاوی اور محیط ہے۔

ایک حدیث قدسی میں ہے۔ ان رحمتی سبقت غضبی۔ میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔

قرآن مجید میں ایک جگہ ایک پیغمبر برحق (حضرت یعقوب علیہ السلام) کی زبان سے کہلوایا گیا۔

اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ (یوسف۔87)

ترجمہ۔ اللہ کی رحمت سے وہی لوگ مایوس ہو سکتے ہیں۔ جو خدا کے منکر اور اس کی ذات و صفات سے نا آشنا ہیں۔

دوسری جگہ ایک دوسرے جلیل القدر پیغمبر (حضرت ابراہیم علیہ السلام) کا قول نقل کیا گیا ہے۔

وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ۔

ترجمہ۔ اپنی ربّ کی رحمت سے گمراہوں کے سوا کون مایوس ہو سکتا ہے۔

اسی طرح حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توبہ کی فضیلت و ترغیب اور

خدا کی رحمت کی وسعت کا اعلان کر کے یاس وقنوط کی ماری ہوئی انسانیت کوئی زندگی کا پیغام دیا۔ اور اس کے تن مردہ میں نئی روح پھونکی۔ اور اس کو خاک مذلت سے اٹھا کر عزت وشرف، خود اعتمادی اور خدا شناسی کے بام عروج تک پہنچا دیا۔

دین ودنیا کی وحدت کا تصوّر:

قدیم مذاہب اور فلسفوں نے جہاں تمدن انسانی میں دوسری خرابیاں پیدا کر دی تھیں وہاں ان کی تعلیمات نے زندگی کو دو خانوں (دین و دنیا) میں تقسیم کر دیا تھا۔ اور دنیا دو کیمپوں، اہل دین اور اہل دنیا میں بٹ گئی تھی۔ جو نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے سے جدا تھی بلکہ یہ دونوں کیمپ ایک دوسرے سے متصادم اور باہم متحارب تھے۔ ان کے نزدیک دین اور دنیا میں کھلا تضاد اور شدید رقابت تھی۔ جن کو ان میں سے کسی ایک سے راہ و رسم پیدا کرنی ہوتی تو اس کو دوسری سے قطع تعلق اور اعلان جنگ کرنا ضروری تھا۔ کوئی انسان ایک وقت میں ان دو کشتیوں پر سوار نہیں ہو سکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ انسان عام طور پر سہولت پسند اور لذت پرست واقع ہوا ہے۔ اس لیے دین کا ایسا تصوّر جس میں دنیا کی کسی جائز ترقی اور سر بلندی اور طاقت وحکومت کے حصول کی گنجائش نہ ہو۔ انسانوں کے لیے قابل قبول نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کے متمدن، ذہین، صاحب صلاحیت اور با عمل انسانوں کی بڑی تعداد نے اپنے لیے دین کی بجائے ''دنیا'' کا

انتخاب کیا۔ وہ ہر قسم کی دینی ترقی سے مایوس ہو کر دنیا کے حصول اور اس کی ترقی میں مشغول ہو گئی۔ سیاست اور ریاست نے مذہب کے نمائندہ کلیساء سے بغاوت اور اپنے آپ کو اس کی ہر پابندی سے آزاد کر لیا۔ رقابت نے نہ صرف یہ کہ مذہب اور اخلاق کے اثر کو محدود کر دیا بلکہ ایسے الحاد ولادینیت کا دروازہ کھولا جس کا سب سے پہلے یورپ شکار ہوا پھر دنیا کی دوسری قومیں جو یورپ کے فکری، عملی یا سیاسی اقتدار کے زیر اثر آئیں۔ اس سے کم و بیش متاثر ہوئیں۔ دنیا کی موجودہ صورت حال، جس میں مذہب اور اخلاق کا زوال اور نفس پرستی اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی ہے۔ جو صرف اسی ''دین'' اور ''دنیا'' کی تفریق کا نتیجہ ہے۔

داعیٔ انقلاب پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عظیم ترین معجزہ اور انسانیت کے لیے عظیم ترین تحفہ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمۃ للعالمینی کا مظہر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کامل طور پر رسول صلی اللہ علیہ وسلم وحدت ہیں اور بیک وقت ''بشیر'' و ''نذیر'' ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین و دنیا کے تضاد اور تفریق کے نظریہ کو ختم کر کے پوری زندگی کو عبادت میں اور پورے روئے زمین کو ایک وسیع عبادت گاہ میں تبدیل کر دیا۔ دنیا کے انسانوں کو متحارب کیمپوں سے نکال کر، حسن عمل، خدمت خلق اور حصول رضا الٰہی کے ایک ہی محاذ پر کھڑا کر دیا۔ یہاں لباس دنیا میں درویش، قباء شاہی میں فقیر و زاہد، سیف و تسبیح کے جامع، رات کے عبادت گزار اور دن کے

شاہسوار نظر آئیں گے اور ان کو اس میں کسی قسم کا تضاد محسوس نہیں ہوگا۔

(6) نصب العین کا تعین:

بعثت محمدی ﷺ سے پہلے انسان اپنی منزل مقصود سے بے خبر تھا۔ اسے یاد نہیں رہا تھا کہ اس کو کہاں جانا ہے؟ اس کی صلاحیتوں کا اصل میدان اور اس کی کوششوں کا اصل نشانہ کیا ہے، انسان کے پیش نظر کچھ موہوم منزلیں۔ محدود مقاصد کے چھوٹے چھوٹے دائرے تھے۔ جس میں انسانوں کی ذہانت اور قوت عمل صرف ہو رہی تھی۔ کامیاب اور بڑا انسان بننے کا بڑا مقصد صرف یہ تھا۔ کہ دولت مند بن جاؤں۔ طاقتور اور حاکم بن جاؤں۔ لاکھوں انسان ایسے تھے جن کا پرواز تخیل نقش و نگار، لذت و ذائقہ یا داد و دہش یا حیوانوں کی تقلید سے بلند نہیں ہوتا تھا۔ ہزاروں انسان ایسے تھے۔ جن کی ساری ذہانت اپنے زمانہ کے دولت مندوں، طاقتوروں اور سرکار و دربار کی خدمت و خوشامد بے مقصد ادب و شاعری سے دل خوش کرنے میں صرف ہو رہی تھی۔

داعیٔ انقلاب محمد رسول اللہ ﷺ نے نسل انسانی کے سامنے اس کی حقیقی منزل لا کر کھڑی کر دی۔ آپ ﷺ نے خالق کائنات کی صحیح معرفت، اس کی ذات وصفات اس کی قدرت وحکمت کا صحیح علم، ایمان و یقین کا حصول، خدا کی محبت ومحبوبیت، اس کی رضا، اس کی کثرت میں وحدت کی تلاش اور اس کی ریاضت کو منزل مقصود قرار دیا۔ انسان کی حقیقی

سعادت اور کمال یہ کہ اپنی ظاہری و باطنی قوتوں کو ترقی دینا۔ ایمان و یقین کی دولت سے مالا مال ہونا۔ انسانوں کی خدمت اور ایثار و قربانی کے ذریعہ خدا کی خوشنودی کا حاصل کرنا اور کمال اور ترقی کے دیگر مدارج تک پہنچنا، انسان کی کوششوں کا حقیقی میدان قرار پایا۔

لہٰذا آپ ﷺ کی بعثت کے بعد دنیا کی رت بدل گئی۔ مزاج بدل گئے۔ خدا کی محبت اور طلب کا ذوق پیدا ہوا۔ قلوب میں نئی حرارت اور دماغوں میں نیا جذبہ پیدا ہوا۔ انسان اپنی حقیقی منزل مقصود کی تلاش اور اس پر پہنچنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ اور ایسا معلوم ہونے لگا۔ جیسے انسانیت صدیوں کی نیند سے بیدار ہوئی ہو۔

درحقیقت یہ انقلاب عظیم داعیٔ انقلاب حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا عظیم معجزہ اور آپ ﷺ کی ''رحمۃ للعالمین'' کا کرشمہ ہے۔(1)

---

(1) نبی رحمت ﷺ۔ ص 211 تا 232 کی تلخیص پیش کی گئی ہے (مولف)

اسلامی نظام تعلیم کی اساس

انسانی تاریخ میں تعلیم کا مسئلہ نیا مسئلہ نہیں جوں ہی انسان نے اس کائنات میں قدم رکھا تعلیم و تدریس کے مسئلے نے بھی ساتھ جنم لیا۔ انسانی زندگی کے ارتقائی ادوار کے ساتھ ساتھ یہ پہلو بھی ارتقاء پذیر رہا حتیٰ کہ چھٹی صدی عیسوی میں اسلام کا سورج طلوع ہوا۔ جس سے تعلیم و تدریس کے عمل کا ایک انقلابی دور شروع ہوا۔ اسلام میں تعلیم و تربیت کے عمل کو مخصوص اور ٹھوس بنیادوں پر استوار کیا گیا۔ تا کہ نہ صرف علوم و معارف کی اہمیت واضح ہو جائے بلکہ ان بنیادوں پر عمل کر کے مسلمان قوم کی ایک عظیم اور دیرپا تہذیب کی بنیاد رکھی جا سکے۔ اور اس سے فارغ التحصیل ہونے والے طلباء کی فکر و نظر میں اسلامی شعائر مضبوط ہوں۔ اور ان کا انداز فکر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انسانیت اور انسانی معاشرہ کے لیے تعمیری ہو۔

> ”اسلامی تہذیب و تمدن میں علوم و معارف کا درجہ بہت بلند ہے۔ قرآن مجید اور احادیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ہر مسلمان کو تعلیم کے لیے کوشاں رہنا چاہیے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے جو نکتہ انسانی فکر کے سامنے آیا وہ یہ ہے کہ کون سا علم

سب سے پہلے حاصل کرنا چاہیے بڑے بڑے فقہاء اور علماء اس بات پر متفق ہیں کہ فرض عین کے تحت علوم مثلاً دینی علوم اور شرعی علوم کا جاننا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ یہ اپنی نوعیت میں اکمل ہیں اور سچائی کے سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ ان علوم سے فارغ التحصیل طلباء کا تفکر بھی اسلامی ہوگا۔ اور معاشرہ کے استحکام کے لیے ان کی کوششیں ہمیشہ تعمیری ہوں گی۔ ان کے ذہن میں حلال وحرام کی تمیز ہوگی۔ اور روزمرہ زندگی میں ان ضوابط وقواعد کو اپنائیں گے جس کا حاصل قرآن ہے۔(1)

اس لیے مسلمانوں کی تعلیم وتربیت کی اساس جن چیزوں پر رکھی گئی ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر محمد اسلم لکھتے ہیں:۔

''عہد رسالت میں تعلیمات کی بنیاد ''الکتاب'' پر رکھی گئی۔ اس ''الکتاب'' نے جزیرۃ العرب میں بعد ازاں پورے عالم میں ایک فکری انقلاب کی نیو رکھ دی تھی۔ جس کے اثرات مشرق و مغرب میں ہر زمانے میں محسوس کیے گئے۔ عہد رسالت کا نظام تعلیم لازمی طور پر قرآن مجید وفرقان حمید ہی کے تابع تھا وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ (بنی اسرائیل۔36) کا اعلان کر کے جہاں اوہام پرستی کی جڑ کاٹ کر علم کی پیروی کا

(1) تاریخ التعلیم۔ ص 11۔

حکم دیا گیا۔ وہاں ظن وتخمین اور لاطائل قیاسات پر مبنی علوم کو بھی باطل قرار دے دیا گیا۔ معلوم رہے کہ اس ضمن میں پالیسی یہ تھی کہ مسلمان صرف وحی اور قرآن کی طرف متوجہ رہیں۔ تاکہ نزول وحی مسلمانوں کی سوچ۔ فکر کردار اور شخصیت کو خاص سانچے میں ڈھال دے۔ اس پالیسی پر مکہ کے تیرہ 13 سالہ قیام کے دوران اور ہجرت مدینہ کے بعد ابتدائی چند سالوں تک عمل رہا۔'' (1)

اسلام نے مسلمانوں میں دینی شعور پیدا کرنے کے لیے جن خاص دینی احکام کی تعلیم کی ضرورت محسوس کی ہے۔ اس کے پیش نظر قرآن اور وحی الٰہی کو بنیاد قرار دیا گیا ہے جیسا کہ اقتباسات بالا سے ظاہر ہے۔ اب دوسرا پہلو یہ رہ جاتا ہے کہ۔

''اس کارخانۂ حیات کو چلانے کے لیے دیگر بیشمار علوم ایسے ہیں جو فرض کفایہ کے تحت آتے ہیں۔ مثلاً مادی۔ حیاتیاتی اور نفسیاتی علوم ہیں۔ جن کے حصول کے لیے برابر تلقین کی گئی ہے۔ اگر ان مذکورہ بالا علوم میں باہمی ربط پیدا ہو جائے تو یہ اسلامی نظریۂ تعلیم کی مثال ہوگی اور اس کی بدولت اسلامی معاشرہ بھی تمدنی، سیاسی، اقتصادی اور معاشی ترقی کے اعتبار سے معراج کمال تک پہنچ جائے گا۔'' (2)

اس سلسلے میں عہد نبوی ﷺ کے نظام تعلیم کا جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر

(1) (اسلامی تعلیم ص 27) شمارہ ستمبر اکتوبر 1972ء

(2) اسلامی تعلیم ص 27۔

محمد اسلم صاحب لکھتے ہیں:

"مگر دیگر علوم اور زبانیں سیکھنے کی بھی عام اجازت دے دی گئی کیونکہ قرآن کا بپا کردہ فکری اور اخلاقی انقلاب ہجرت کے بعد بتدریج غالب آ رہا تھا۔ اسلامی آداب، تہذیب اور اقدار تیزی سے تکمیل کے مدارج طے کر رہی تھیں۔ اور اب احتمال نہ تھا کہ غیر قرآنی لٹریچر مسلمانوں کے دلوں میں کسی قسم کا شک وشبہ پیدا کر سکے گا۔ لہٰذا دربار رسالت ﷺ سے عبرانی اور دیگر علوم سیکھنے کا حکم صادر ہوا۔ تاہم قرآن میں بار بار اس قسم کی یقین دہانی کرائی جاتی رہی کہ مسلمانوں کا اصل مشن اور بڑا مقصد وہی ہے۔ جو قرآن نے متعین کر دیا ہے۔ اَلرَّحْمٰنُ o عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ o اور (رحمن۔201) اور لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ (توبہ122)

"رسول خدا ﷺ نے قرآنی آیات سکھانے کو حق مہر قرار دیا۔ یعنی قرآن کی حیثیت بطور محور نظام تعلیم کس طرح متاثر نہیں ہوئی۔" (1)

مذکورہ بالا اقتباسات کی روشنی میں وحی الٰہی اور قرآن مجید کو اسلامی نظام تعلیم کی اساس قرار دیا گیا ہے۔ تاہم دنیوی علوم ومعارف کی افادیت کو بھی تسلیم کیا گیا ہے ان ہر دو علوم کی تحصیل کے لیے اسلام میں برابر تلقین کی گئی ہے۔

(1) اسلامی تعلیم ص 27۔

جس سے نہ صرف انسان میں مثبت اور تعمیری انداز فکر پیدا ہوتا ہے۔ بلکہ مادی زندگی کو بطریق احسن گزارنے اور ان کے تقاضوں کو پورا کرنے کے بھی بے پناہ مواقع موجود ہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ بنیادی ماخذات کی روشنی میں ان اساس کی نشاندہی کی جائے جس پر اس ساری عمارت (اسلام) کا دارو مدار ہے۔ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جس کی ہمہ گیری زندگی کے ہر پہلو کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اور اللہ کے نزدیک ساری انسانیت کے لیے واحد مستند دین یہی ہے صرف اس کو اپنا کر انسان فلاح دارین حاصل کرسکتا ہے۔

قرآن حکیم میں انسانی ہدایات کے جو راستے متعین کئے گئے ہیں۔ وہی دراصل دینی اور دنیاوی تعلیم کی اساس ہیں۔ ان اساسی تصورات کو قرآن حکیم۔ احادیث نبوی ﷺ اور حضور اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی روشنی میں حسب ذیل سطور میں بیان کیا گیا ہے۔

(1) توحید:

تاریخی پس منظر میں ہم نے اس بات کو بغور جائزہ لیا ہے کہ طلوع اسلام سے پہلے وحدت خداوندی کا عقیدہ ختم ہو چکا تھا۔ اور سابقہ پیغمبروں کی تعلیم کے خدو خال مٹ چکے تھے۔ چنانچہ خدا کی وحدانیت کو اسلام کے سارے نظام کی بنیاد قرار دیا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ساری کائنات کا خالق اور مالک اور فرمانروا اللہ تعالیٰ ہے۔ جس میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ سارے انسان اس کے بندے اور غلام ہیں۔ سرداری اور

فرمانروائی صرف اسی کے لیے مخصوص ہے۔

اسلام کے پورے اعتقادی اور عملی نظام میں پہلی اور بنیادی چیز ایمان باللہ ہے باقی جتنے اعتقادات ہیں وہ سب اسی ایک اصل کی فروع ہیں اور جتنے اخلاقی احکام اور تمدنی قوانین ہیں سب اس مرکز سے قوت حاصل کرتے ہیں۔اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے۔ اس کا مصدر اور مرجع خدا کی ذات ہے۔رسولوں پر ایمان اس لیے ہے کہ وہ خدا کے بھیجے ہوئے ہیں۔ کتابوں پر ایمان اس لیے ہے کہ وہ خدا کی نازل کردہ ہیں۔ ملائکہ پر ایمان اس لیے ہے کہ وہ خدا کے ملائکہ ہیں یوم آخر پر ایمان اس لیے ہے کہ وہ خدا کا مقرر کیا ہوا انصاف کا دن ہے۔ اسلام کے اخلاقی اور تمدنی قوانین جن میں فرائض، حقوق اور امر ونواہی کے احکامات شامل ہیں۔ وہ سب خدا کی جانب سے ہیں۔غرض ہر چیز جو اسلام میں ہے خواہ عقیدہ ہو یا عمل اس کی بنا عقیدۂ توحید پر قائم ہے اسی ایک چیز کو اگر الگ کر دیا جائے تو نہ ملائکہ کوئی چیز ہیں نہ رسول اتباع کے مستحق، نہ ان کی کتابیں معتبر، نہ فرائض کی کوئی معنویت رہ جاتی ہے۔ نہ حقوق وفرائض کی کوئی اہمیت ہے نہ امر ونواہی قوت نفاذ کے حامل رہتے ہیں۔ اس ایک نظام مرکز سے ہٹتے ہی یہ سارے کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔

یہ عقیدہ جو اس عظیم الشان فکری وعملی نظام کے مرکز ومنبع کا کام دے رہا ہے محض اس قدر نہیں کہ ”اللہ تعالیٰ موجود ہے“ بلکہ وہ اس کے اندر اس

کی صفات کا ایک مکمل اور صحیح تصوّر رکھتا ہے۔ اور اسی تصوّر صفات سے وہ قوت حاصل ہوتی ہے جو انسان کی تمام فکری و عملی قوتوں پر محیط اور حکمران ہو جاتی ہے۔ محض ہستی باری تعالیٰ کا اثبات وہ چیز نہیں ہے جسے اسلام کی امتیازی خصوصیت کہا جا سکتا ہو۔ یہ چیز کسی نہ کسی شکل میں دوسری ملتوں میں کسی نہ کسی انداز میں پائی جائی ہے۔ جس چیز نے اسلام کو دوسرے مذاہب اور ادیان سے ممتاز کر دیا ہے۔ وہ یہی ہے۔ کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی غالب اور پر حکمت صفات کا صحیح، مکمل اور مفصل علم بخشا ہے۔ پھر اس علم کو ایمان بنا کر اس سے انسانی تزکیۂ نفس، اصلاح و اخلاق، تنظیم اعمال اور خیر و شر اور تمدن کی بنیاد بنا کر اتنا بڑا کام کیا ہے۔ جو دنیا کی کسی مذہب و ملت نے نہیں کیا۔ یہ وہ کلمہ "لا الہ الا اللہ" ہے یعنی دل سے اس امر کی تصدیق اور زبان سے اس امر کا اعتراف کہ اللہ بجز ایک ہستی کوئی نہیں جس کا نام "اللہ" ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ "الوھیت" کو کائنات کی جملہ اشیاء سے سلب کر کے صرف ایک ذات کے لیے مختص کیا جائے اور دیگر تمام جذبات، تخیلات، اعتقادات، طاعات اور عبادات جو صرف "الوہیت" کے لیے مخصوص ہیں اسی ایک ذات کے ساتھ متعلق کر دیا جائے۔ قرآن مجید میں خدائی ذات اور صفات کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ سب اسی کلمہ میں مضمر تین امور کی تفصیل ہیں۔ (1) الوہیت کا تصوّر (2) تمام اشیاء سے اس کی نفی۔ (3) صرف اللہ کے لیے اس کا اثبات۔

لہٰذا کائنات کی کوئی ایسی شے نہیں جو الوہیت کا شائبہ بھی اپنے اندر رکھتی ہو۔ قرآن مجید میں بیسیوں چھوٹی بڑی آیات صفات الٰہی کے اسی تصور کی توضیح وتشریح کرتی ہے۔ اور اس تصور کے ساتھ جو ایمان باللہ انسان کے دل میں داخل ہو جائے وہ اپنے اندر ایسے غیر معمولی فوائد رکھتا ہے جو کسی دوسرے اعتقاد سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(1) توحید انسان کی فطری آزادی کی ضمانت دیتی ہے۔ اور فطری آزادی سے مراد ایسی متعین اور محدود آزادی ہے جس کو انسان طبعاً اختیار اور پسند کرتا ہے۔ اسلام اپنے عقیدہ توحید کے ذریعے فرد اور قوم کو آزادی کی ضمانت دیتا ہے۔ مگر دوسروں کی آزادی کے تحفظ کی خاطر ان کی آزادی کو حقوق اللہ اور حقوق العباد کی شرط سے مشروط کرتا ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ بات اس کی آزادی کی توسیع ہے کیونکہ یہ فطری ہے لہٰذا ان حقوق کے احترام سے انسان میں اپنے مقام عبدیت کا شعور اجاگر ہوتا ہے۔

(2) توحید پر ایمان کے بعد جو دوسری چیز انسان کے اندر پیدا ہوتی ہے وہ وسعت نظر ہے۔ جب تک انسان دنیا کو اپنے نفس کے یقین پر اعتبار کرتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس کی نگاہ اسی تنگ دائرے میں محدود رہتی ہے۔ جس کے اندر اس کی اپنی قدرت، اپنا علم اور اپنے رجحانات ہیں۔ اسی دائرے کے اندر وہ اپنے لیے حاجت روا تلاش کرتا ہے اور اس دائرے میں اس کی دوستی، دشمنی، محبت ونفرت وتعظیم وتحقیر محدود رہتی ہے۔ لیکن خدا

پر ایمان لانے کے بعد اس کی نظر اپنے ماحول سے نکل کر تمام کائنات پر پھیل جاتی ہے۔ اب وہ کائنات کو اپنے نفس کے تعلق سے نہیں بلکہ خدا کے تعلق سے نگاہ ڈالتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ میں جس خدا کو مانتا ہوں وہ صرف میرا اور میرے خاندان یا میری قوم کا ہی مالک اور پروردگار نہیں ہے۔ بلکہ خالق السموات والارض اور رب العالمین ہے اس کی عبادت صرف میں ہی نہیں کر رہا بلکہ زمین و آسمان کی ساری چیزیں اس کی تسبیح خوان ہیں:

وَلَهُ أَسْلَمَ مَن فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ طَوْعاً وَكَرْهاً

(آل عمران 83)

ترجمہ: حالانکہ سب اہل آسمان و زمین خوشی یا زبردستی سے خدا کے فرمانبردار ہیں۔

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ

(بنی اسرائیل 44)

ترجمہ: ساتوں آسمان اور زمین اور جو لوگ ان میں ہیں سب اس کی تسبیح کرتے ہیں۔

پس جو اللہ پر ایمان رکھتا ہے۔ وہ کبھی تنگ نظر نہیں ہو سکتا اس کی وسیع المشربی کے لیے بین الاقوامیت کی اصلاح بھی تنگ ہے۔ وہ تو حقیقت میں آفاقی ''اور کائناتی'' انسان بن جاتا ہے۔

(3) اس عقیدہ کی تیسری خوبی یہ ہے۔ کہ یہ انسان میں انکسار اور خشوع

پیدا کر دیتا ہے۔ جب خدا کے ساتھ اپنے اور تمام موجودات عالم کے تعلقات کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لیتا ہے تو نتیجۃً اس میں نخوت، غرور اور تکبر پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی خودداری انکسار کے ساتھ اور عزت نفس خشوع کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ (انعام-18) اور وہ جانتا ہے کہ خدا کی طاقت کے سامنے وہ بالکل بے بس ہے۔

(4) خالق و مخلوق کے تعلق کی صحیح معرفت جو اس عقیدہ توحید سے پیدا ہوتی ہے اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ ان تمام غلط توقعات اور جھوٹے بھروسوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ جو عدم معرفت کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے۔ اور انسان خوب سمجھ لیتا ہے۔ کہ اس کے لیے اعتقاد صحیح اور عمل صالح کے سوا فلاح و نجات کا کوئی راستہ نہیں ہے اللہ کے ہاں نہ کوئی خوشامد اور سفارش کام آ سکتی ہے نہ کوئی دوسری غلط توقعات جو لوگوں کو ہمیشہ گناہ کے چکر میں پھنسائی رکھتی ہیں۔ اور ان کے بھروسہ پر اپنے نفس کی پاکیزگی اور عمل کی اصلاح سے غافل ہو جاتے ہیں۔ بلکہ اس کے ہاں صرف یہ معیار فضیلت رہ جاتا ہے۔

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (الحجرات-13)

(5) اس عقیدہ کی ایک خوبی یہ ہے۔ کہ یہ انسان میں ایک ایسی رجائی کیفیت پیدا کر دیتا ہے جو کسی حال میں مایوسی اور شکستہ دلی سے مغلوب نہیں ہوتی۔ مومن کے لیے ایمان امیدوں کا ایک لازوال خزانہ ہے۔ جس سے اسے دائمی اور غیر منقطع قوت اور تسکین کی دولت کی رسد اس

کے قلب و روح کو پہنچتی رہتی ہے۔ ایک خدا کا سہارا اس کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑتا۔ اور اس کے بل پر وہ ہمیشہ امیدوں سے لبریز رہتا ہے۔ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ۔(اعراف۔7-156) کی چادر کی لپیٹ میں رہتا ہے۔

(6) پھر یہی رجائیت ترقی کر کے صبر واستقامت اور توکل علی اللہ کے اعلیٰ مدارج پر پہنچ جاتی ہے۔ جہاں مومن کا دل ایک سنگین چٹان کی طرح مضبوط اور مستحکم ہو جاتا ہے اور ساری دنیا کی مشکلیں، تکلیفیں، مضرتیں اور مخالف طاقتیں مل کر بھی اس کو اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتیں۔ یہ قوت انسان کو بجز ایمان باللہ کسی اور ذریعے سے حاصل نہیں ہوتی کیونکہ خدا پر جو ایمان نہیں رکھتا اور اس کا بھروسہ مادی وسائل اور اسباب پر ہوتا ہے حالانکہ وہ خود کسی طاقت کے مالک نہیں ہیں۔

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا۔ (البقرہ۔2-256)

ترجمہ: جس نے طاغوت کو چھوڑ دیا اور خدا کا دامن تھام لیا۔ اس کا سہارا ایسا مضبوط ہے کہ وہ کبھی ٹوٹ ہی نہیں سکتا۔

(7) پھر اسی سے ملتی جلتی کچھ اور صفات بھی ہیں جو ایمان باللہ سے غیر معمولی طور پر پیدا ہوتی ہیں وہ ہیں جرأت، بسالت، شجاعت اور شہامت۔ دراصل انسان کو بزدل بنانے والی دو چیزیں ہیں ایک محبت اور دوسرا

خوف۔ ایمان باللہ ان دونوں چیزوں کو دل سے نکال دیتا ہے کیونکہ انہی چیزوں سے انسان کے دل میں حرص وہوس اور رشک وحسد جیسے رکیک جذبات پیدا ہوتے ہیں جو بنی نوع انسان کے درمیان فساد برپا کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں ایمان باللہ سے انسان کے اندر قناعت واستغناء پیدا ہو جاتا ہے۔ اور وہ باعزت طریقے سے رب کا فضل تلاش کرتا ہے جو کچھ مل جاتا ہے۔ اس کو اللہ کی دین سمجھ کر قناعت کر لیتا ہے۔

(8) ان سب سے زیادہ اہم فائدہ وہ ہے جو ایمان باللہ کے ذریعے انسانی تمدن کو پہنچتا ہے وہ اصلاح اخلاق، تنظیم اعمال ہے یہ چیزیں انسانی جماعت کے افراد میں احساس ذمہ داری پیدا کرتی ہیں۔ یہ فائدہ علم الٰہی اور قدرت خداوندی کے اس اعتقاد سے حاصل ہوتا ہے۔ جو ایمان کا اشد ضروری جز ہے۔ جس کا ذکر قرآن مجید میں بار بار کیا گیا ہے کہ خدا کا علم ہر چیز پر حاوی ہے۔ اور کوئی بات اس چھپ نہیں سکتی۔

رسالت:

اسلام کا دوسرا عقیدہ رسالت ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے اپنے رسول بھیجے جو سب برحق ہیں اور ان پر ایمان لانا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ اور اس سلسلے کی آخری کڑی حضور محمد ﷺ ہیں۔ جن پر قرآن نازل ہوا۔ اور جن پر نبوت کا سلسلہ ختم ہوا۔ قرآن کی تعلیمات اور اسوۂ حسنہ تا ابد سارے انسانوں کے لیے ہدایت

خداوندی اور نجات انسانی کا ذریعہ ہیں۔

توحید کے بعد اسلام کا دوسرا بنیادی عقیدہ ''رسالت'' جس طرح اعتقاد کی جہت میں توحید اصل دین ہے۔ اسی طرہ اتباع کی جہت میں رسالت اصل دین ہے۔ رسالت کے لغوی معنی پیامبری کے ہیں۔ جو شخص کسی کا پیغام کسی دوسرے کے پاس لے جائے۔ وہ ''رسول'' ہے۔ مگر اسلام کی اصطلاح میں رسول اس کو کہتے ہیں۔ جو خدا کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچائے اور خدا کے حکم سے راہ راست کی طرف ان کی رہنمائی کرے اس لیے قرآن میں رسول کے لیے ''ھادی'' کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی وہ سیدھا راستہ دکھانے والا۔ جو لوگ اس منصب پر سرفراز کیے گئے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیر معمولی علم اور نور بصیرت عطا کیا گیا ہے۔ جس سے وہ ظن وتخمین کی بنا پر نہیں بلکہ علم یقین کی بنا پر ان امور کی حقیقت جان گئے ہیں۔ جن میں عامۃ الناس اختلاف کرتے ہیں۔ اور اس نور بصیرت سے انہوں نے ٹیڑھے راستوں میں حق کا سیدھا اور صاف راستہ دیکھ لیا ہے۔

خارجی رہنما کی ضرورت ہر زمانہ میں انسان نے تسلیم کی ہے، اور کبھی دعویٰ نہیں کیا گیا۔ کہ انسان کے لیے محض اپنے کسی باطنی رہنما کی ہدایت کافی ہے۔ آباؤ اجداد، خاندان اور قبیلے کے بزرگ، اساتذہ، اہل علم۔ مذہبی پیشوا، سیاسی لیڈر اور مصلحین جن کی دانشمندی پر بھروسہ کیا جا سکتا

تھا۔ انہیں ہمیشہ رہنمائی کا منصب دیا گیا ہے۔ اور ان کی تقلید کی گئی ہے۔ لیکن جو چیز ایک رسول کو ان دوسری قسم کے رہنماؤں سے ممتاز کرتی ہے وہ "علم" جو دوسرے رہنماؤں کے پاس نہیں۔ وہ محض ظن و تخمین کی بنیاد پر رائے قائم کرتے ہیں۔ جس میں ہوائے نفس کے عناصر اور حق و باطل دونوں کی آمیزش ہوتی ہے۔

بخالف اس کے رسول کو اللہ کی طرف سے جو "علم" عطا کیا جاتا ہے اس کی رہنمائی گمان اور ہوائے نفس کی بنیاد پر نہیں ہوتی بلکہ وہ خدا کے عطا کردہ نور علم سے جس سیدھے راستے کو صاف اور واضح دیکھتا ہے، اسی کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں جہاں کہیں انبیاء کو "رسالت" کے منصب پر سرفراز کرنے کا ذکر آتا ہے۔ وہاں یہی کہا جاتا ہے کہ ان کو علم بخشا گیا، مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام سے نبوت کا اعلان اس طرح کرایا جاتا ہے۔

يَا اَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَاءَ نِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْ اَهْدِكَ صِرَاطاً سَوِيًّا۔ (مریم۔19-43)

ترجمہ: اے پدر عزیز یقین جان کہ میرے پاس وہ علم آیا ہے جو تیرے پاس نہیں آتا۔ لہٰذا تو میری پیروی کر میں تجھے سیدھے راستے پر چلاؤں گا۔

لوط علیہ السلام کو نبوت بخشنے کا ذکر اس طرح کیا جاتا ہے۔

وَلُوطاً اٰتَیْنٰہُ حُکْماً وَّعِلْماً (الانبیاء 21-74)

ترجمہ: اور لوط علیہ السلام کو ہم نے قوت فیصلہ اور علم بخشا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّہٗ وَاسْتَوٰٓی اٰتَیْنٰہُ حُکْماً وَّعِلْماً (القصص 28-14)

ترجمہ: اور وہ جب اپنی پوری جوانی کو پہنچا اور پورا آدمی بن گیا تو ہم نے اسے قوت فیصلہ اور علم عطا کیا۔

حضرت داؤد اور سلیمان علیہم السلام کو نبوت بخشتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔

وَکُلًّا اٰتَیْنَا حُکْماً وَّعِلْماً (الانبیاء 21-79)

ان میں سے ہر ایک کو ہم نے حکم اور علم عطا کیا۔

نبی مکرم ﷺ سے فرمایا جاتا ہے

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَھْوَآءَھُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَکَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَکَ مِنَ اللّٰہِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ ○ (البقرہ 2-120)

اور اگر تم نے اس علم کے بعد جو تمہارے پاس آیا ہے ان کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ سے تم کو بچانے والا کوئی حامی اور مددگار نہ ہوگا۔

جب رسول کے پاس "علم" کا ایسا ذریعہ ہے۔ جو دوسرے لوگوں کو حاصل نہیں ہے اور خدا کی طرف سے اس کو بصیرت کا وہ نور عطا کیا گیا ہے۔ جس سے عام انسان محروم ہیں تو خدا کے بارے میں صرف وہی اعتقاد صحیح ہو

سکتا ہے۔ جو رسول نے پیش کیا ہے اگر کوئی شخص خود اپنے غور و فکر یا دوسرے عقلا و حکما کی تعلیمات پر کوئی اعتقاد قائم کرے تو نہ صرف خدا کے بارے میں اس کا عقیدہ درست نہیں ہو سکتا بلکہ وہ دوسرے امور ماورائے طبیعت کے بارے میں بھی کوئی سچی واقفیت بہم نہیں پہنچا سکتا۔ جو دین کے بنیادی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور عام انسانی عقل کی دسترس سے باہر ہیں۔ بس جملہ ایمانیات اور معتقدات کی صحت کا، انحصار ایمان بالرسل پر ہے۔ اسی طرح ایمان باللہ اور ایمان بالرسول کا باہمی تعلق نا قابل انقطاع ہے جو شخص خدا کے رسولوں کا انکار کرتا ہے اور ان کی تعلیم کو قبول نہیں کرتا۔ وہ چاہے خدا کو مانے یا نہ مانے دونوں حالتوں میں اس کی گمراہی یکساں ہے کیونکہ خدا کے بارے میں جو اعتقاد رسولوں کے علم کے بغیر قائم کیا جائے گا۔ وہ ہرگز صحیح نہ ہوگا۔ خواہ وہ عقیدۂ توحید ہی کیوں نہ ہو۔ صرف ایمان بالرسل ہی وہ چیز ہے جو بنی نوع انسان کو ایک عقیدہ پر جمع کر سکتی ہے اختلاف کی بنا دراصل جہالت ہے لوگ جس چیز کی حقیقت سے واقف نہ ہوں گے اس کے متعلق گمان کی بنا پر قیاس آرائیاں کریں گے اور لامحالہ ان کے درمیان اختلاف ہوگا۔ کیونکہ گمان اور قیاس کی مدد سے رائے قائم کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے اندھیرے میں ٹٹولنا۔ تمام انبیاء ایک ہی دین حق کی طرف بلاتے ہیں اور وہ ہر قوم کی طرف بھیجے جا چکے ہیں تو ان کے متعلق صحیح اعتقاد یہ ہے کہ وہ سب اسلام کے داعی تھے۔ مگر قوموں نے ان کی تعلیمات کو بدل دیا اور آپس میں اختلاف کر کے

الگ الگ مذہب بنا لیے۔ انبیاء کے متعلق قرآن کی یہ تعلیم بے نظیر ہے کہ اور کسی مذہب میں ایسی تعلیم موجود نہیں۔ یہ صداقت قرآن کی روشن دلیل ہے اور بنی نوع انسان کے لیے اس میں عالمگیر اتفاق اور وحدت کلمہ کا ایک سکون بخش پیغام مضمر ہے۔

رسالت کے اعتقاد کا لازمی نتیجہ ہے کہ نہ صرف اعتقاد اور عبادات میں بلکہ زندگی کے تمام عملی مسائل میں بھی اسی طریقہ کی پیروی کی جائے جس پر خدا کے رسول چلے ہیں۔ کیونکہ خدا نے جس ''علم'' اور نور بصیرت سے ان کو بہرہ ور کیا تھا۔ اس سے غلط اور صحیح طریقوں کا فرق یقین طور انہیں معلوم ہو جاتا تھا۔ اس لیے وہ جو کچھ ترک اور اختیار کرتے تھے اور جو کچھ حکم دیتے تھے۔ وہ سب خدا کی طرف سے تھا۔ ان کی اطاعت عین خدا کی اطاعت ہے اور ان کا اتباع عین مرضات الٰہی کا اتباع ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (النساء۔ 4-64)

ترجمہ: اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اس لیے بھیجا ہے کہ بحکم خدا اس کی اطاعت کی جائے۔

مَّنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ۔(النساء4-80)

جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْکٰفِرِیْنَ۔(آل عمران3-31-32)

ترجمہ:اے محمد کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو۔ اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا۔ اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

ترجمہ: کہہ دو کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو پھر وہ روگردانی کریں تو یقین رکھو کہ اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔

ایسی اور بیسیوں آیات ہیں جن میں اتباع و اطاعت رسول پر زور دیا گیا ہے۔ پھر سورہ احزاب میں اس امر کی تصریح کر دی گئی ہے کہ رسول اللہ کی زندگی ان لوگوں کی ایک قابل تقلید نمونہ ہے جو اللہ سے بخشش کی اور یوم آخر میں کامیابی کی امید رکھتے ہیں۔

بلا شبہ منصب رسالت کے لحاظ سے محمد ﷺ اور دوسری انبیاء میں کوئی فرق نہیں ہے اور قرآن مجید کا صریح فیصلہ ہے کہ رسولوں کے درمیان کسی قسم کی تفریق جائز نہیں لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ(البقر2-285) لیکن اس کے علاوہ چند امور ایسے ہیں جو خاص طور پر رسالت محمدیہ ﷺ کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ جہاں تک اصول کا تعلق ہے تمام انبیاء اللہ کی طرف سے ''حکم'' اور ''علم'' کے ساتھ مامور کیے گئے ہیں اور سب ایک ہی صراط مستقیم کی طرف بلانے والے ہیں لیکن عملاً اللہ تعالیٰ نے چند امور

میں نبی عربی محمد ﷺ کو دوسرے انبیاء کے مقابلہ میں ایک خاص امتیاز عطا فرمایا ہے۔ اور عملاً اسلام کی تمام معتقدات اور قوانین کی بنیاد رسالت محمدی ﷺ کی اسی امتیازی حیثیت پر قائم ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنَاكَ اِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۝ (سبا۔34-28)

ترجمہ: اور اے محمد ﷺ! ہم نے تم کو تمام ہی انسانوں کے لیے خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے مگر اکثر لوگ اس سے ناواقف ہیں۔

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۝ (الانبیاء 21-107)

ترجمہ: اے محمد ﷺ ہم نے تم کو تمام اہل عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

تَبَارَكَ الَّذِىْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعَالَمِيْنَ نَذِيْرًا۝ (فرقان 25-1)

ترجمہ: پاک ہے وہ ذات۔ جس نے حق و باطل میں فرق کرنے والی کتاب اپنے بندے پر اتاری تاکہ تمام اہل عالم کے لیے ڈرانے والا بنے۔

مَّا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمًا۝ (احزاب۔33-40)

ترجمہ: محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبین ہیں اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

ان آیات کی روشنی میں چند امور کا پتہ چلتا ہے۔

(1) کہ محمد ﷺ کی دعوت کسی زمانے یا کسی قوم یا ملک کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ آپ ﷺ ہمیشہ کے لیے بنی نوع انسان کے ہادی اور رہنما ہیں، اور تمام نوع انسان آپ ﷺ پر ایمان لانے اور آپ ﷺ کا اتباع کرنے کے لیے مکلف ہے۔ یہ کہ آپ ﷺ پر ایمان لائے بغیر اور آپ ﷺ کا اتباع کیے بغیر ہدایت نصیب نہیں ہوسکتی۔ یہ کہ آپ ﷺ تمام جہانوں کے لیے رحمت ہیں۔ اور سلسلہ نبوت تو آپ ﷺ پر اختتام پذیر ہو چکا ہے۔ اور قدیم مذاہب کی جگہ اسلام نے لے لی ہے۔ اور اللہ نے دین مکمل کر دیا ہے اور قیامت تک بنی نوع انسان کے لیے دین اسلام کو ہی پسند کیا ہے۔

مگر ہمارا یہ دعویٰ ہے۔ کہ اسلام ایک عالمگیر انسانی تہذیب ہے تو اس کی عالمگیری، آفاقیت اور عمومیت رسالت محمدی ﷺ کے انہی اعتقادات پر مبنی ہے۔ امت مسلمہ کا نظام جمعیت اسی بنیاد پر قائم کیا گیا تھا۔ کہ جو لوگ محمد ﷺ اور قرآن پر ایمان لائیں وہ سب مسلم اور مومن ہیں۔ ایک ملت ہیں ایک قوم ہیں۔ آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ رنج و راحت میں ایک دوسرے کے شریک ہیں۔

(3) آخرت:

اخروی زندگی پر یقین کرنا اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش ہو کر اپنے اعمال کا حساب دینا یہ تیسرا بنیادی عقیدہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان نے قیامت کے روز اپنے برے یا بھلے عمل کا بدلہ ضرور پانا ہے۔

یوم آخرت سے موت کے بعد کی زندگی ہے اس لیے اس کو حیات آخرت اور دار آخرت بھی کہا گیا ہے۔ قرآن مجید کا شائد کوئی صفحہ ایسا ہو۔ جو اس دوسری زندگی کے ذکر سے خالی ہو۔ طرح طرح سے اس عقیدہ کو ذہن نشیں کرایا گیا ہے۔ اس کی صداقت پر دلائل قائم کیے گئے ہیں۔ اس کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں اس کی اہمیت بتائی گئی ہے اس پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے اور صاف صاف کہا گیا ہے۔ کہ جو شخص اخروی زندگی پر ایمان نہیں رکھتا اس کے اعمال غارت ہو جاتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْ بِاٰيٰتِنَا وَلِقَاءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ○

(اعراف-7-147)

ترجمہ: جو لوگ اس کی آیات اور آخرت میں اس کی ملاقات کا انکار کرتے ہیں ان کے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْ بِلِقَاءِ اللّٰهِ ط (الانعام 6-31)

ترجمہ: بے شک وہ لوگ خسارے میں ہیں جو اللہ سے ملاقات سے انکار کرتے ہیں۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی جو کچھ بھی ہے یہی دنیا کی زندگی ہے اور موت کے معنی بالکل فنا اور معدوم ہو جانے کے ہیں جس کے بعد حیات، شعور، پھل اور نتائج کچھ بھی نہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ کارخانہ عالم جس طرح چل رہا ہے۔ یونہی چلتا رہے گا۔ اور اس نظام میں ایسی پائیداری ہے کہ یہ کبھی درہم برہم ہونے والا نہیں ہے جو لوگ ایسا کہتے ہیں وہ اس بنا پر نہیں کہتے کہ ان کو کسی ذریعہ علم سے بتحقیق ایسا معلوم ہو گیا ہے۔ کہ فی الواقع موت کے بعد کچھ نہیں یا یہ کارخانہ عالم لازوال ہے، بلکہ در اصل انہوں نے محض اپنے حواس پر اعتماد کیا ہے اور یہ رائے اس لیے قائم کی ہے کہ موت کے بعد کی زندگی کی کوئی کیفیت ان کو محسوس نہیں ہوئی اور نظام عالم کی برہمی کے کوئی آثر دیکھے نہیں مگر کیا ہمارا کسی شئے کو محسوس نہ کرنا اس کے انکار کے لیے کافی دلیل ہے؟ موت کے بعد کی کوئی کیفیت چونکہ ہمارے مشاہدے اور تجربے میں نہیں آئی اس لیے زندگی بعد از موت کا اپنے حواس پر اعتماد کر کے اس کے عدم وجود کا حکم لگایا جاتا ہے۔

اگر کہیں پورے معاشرہ کا نظام اخلاق، اسی اعتقاد اور اسی ذہنیت پر قائم ہو جائے تو سرے سے اس معاشرہ کے اخلاقی تصورات ہی بدل جائیں گے۔ اس کا پورا نظام اخلاق خودغرضی اور نفسانیت کی بنیاد پر تعمیر ہو گا۔ نیکی محض دنیوی فائدہ کی ہم معنی ہو جائے گی اور بدی محض دنیوی نقصان کی مترادف ہو کر وہ جائے گی غرض جہاں اس دنیوی زندگی سے

آگے کسی اچھے یا برے نتیجے کے مرتب ہونے کا خوف یا امید نہ ہو وہاں انسان افعال کے صرف انہیں نتائج پہ نظر رکھے گا جو اس دنیا میں ظاہر ہونے والے ہیں۔ اور اسی سے اعمال کی اخلاقی قدروں میں ایسا تغیر واقع ہو جائے گا جو ہرگز کسی کسی مہذب انسانی معاشرہ کے لیے ساز گار نہیں ہو سکتا۔

اس کے مقابلہ میں اسلام نے حیات بعد از موت کا جو نظریہ پیش کیا ہے۔ اس کا خلاصہ ان الفاظ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ کہ جس طرح دنیا کی یہ چیز فرداً فرداً اپنی ایک عمر رکھتی ہے جس کے ختم ہو جانے کے بعد اس میں فساد رونما ہو جاتا ہے اسی طرح اس پورے نظام عالم کی بھی ایک عمر ہے جس کے تمام ہو جانے پر یہ سارا کارخانہ درہم برہم ہو جائے گا۔ اور کوئی دوسرا نظام اس کی جگہ لے گا جس کے قوانین طبیعی اس نظام کے قوانین طبیعی سے مختلف ہوں گے۔ اس نظام کے درہم برہم ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ عدالت قائم کرے گا۔ جس میں ہر چیز کا حساب لیا جائے گا۔ اس کے تمام اعمال جو اس نے اپنی پہلی زندگی میں انجام دیئے ہوں گے ٹھیک ٹھیک جانچے اور تولے جائیں گے حق اور انصاف کے ساتھ فیصلہ کر کے اسے اپنے اچھے اور برے اعمال کی سزا و جزا ملے گی اس لیے انسان کی دنیوی زندگی دراصل اس کی اخروی زندگی کا مقدمہ ہے۔ یہ زندگی عارضی ہے اور وہ پائیدار یہ ناقص اور وہ کامل۔ تمام اعمال کے پورے پورے نتائج اس عارضی زندگی میں مرتب نہیں ہوتے۔ ہر بیج جو یہاں بویا جاتا ہے اپنے

فطری ثمرات کے ساتھ اس ناقص زندگی میں بار آور نہیں ہو سکتا اس نقص کی تکمیل اس دوسری زندگی میں ہوگی اور جو کچھ یہاں بے نتیجہ اور بے ثمر رہ گیا ہے۔ وہ اپنے حقیقی نتائج کے ساتھ وہاں ظاہر ہوگا۔

اس عقیدہ اور نظریہ کی تائید میں قرآن مجید کی بیسیوں آیات موجود ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے زندگی، موت دوبارہ احیائے موتی پر اپنی قدرت کاملہ کا ذکر کیا ہے۔ بلکہ اس نے انسان کو خود اپنے نفس پر غور کرنے کی دعوت دی ہے۔ کہ اس پر ایک ایسا وقت بھی گزرا ہے جب کہ وہ کوئی قابل ذکر شے نہ تھا۔

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا۔ (الدھر 76-1)

ترجمہ: بلا شبہ انسان پر زمانہ کا ایک ایسا وقت بھی گزرا ہے جب کہ وہ کوئی قابل ذکر شے نہ تھا۔

كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۔ (البقرہ-2-28)

ترجمہ: تم مردہ تھے۔ تو خدا نے تم کو زندہ کیا پھر وہ تم کو مردہ کرے گا۔ پھر زندہ کرے گا پھر تم اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ۔ (الحج -22-5)

اگر تم کو مرنے کے بعد جی اٹھنے میں شک ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ

ہم نے مٹی جیسی بے جان چیز سے تم کو پیدا کیا ہے۔

قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِيْ أَنْشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ۔ (یٰسین 36-78)

ترجمہ: اس نے کہا کہ کون ہڈیوں کو زندہ کرے گا جبکہ وہ بوسیدہ ہوں گی؟ کہہ دو" کہ ان کو وہی زندہ کرے گا جس نے انہیں پہلی بار زندگی بخشی تھی۔

قرآن مجید نے حیات اخروی کی ضرورت پر جو دلائل قائم کیے ہیں وہ سب اسی بنیادی نظریہ پر مبنی ہیں کہ اس کائنات کو محض عبث پیدا نہیں کیا گیا اور اس کا بنانے والا ایک حکیم ہے۔ جس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہے۔ اور جس کی طرف کوئی ایسی بات منسوب نہیں کی جا سکتی جو خلاف حکمت ہو۔

أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ۔ (المومنون 23-115)

ترجمہ: کیا تم نے یہ گمان کیا ہے۔ کہ ہم نے تم کو عبث پیدا کیا ہے۔ اور یہ تم ہماری طرف واپس نہ لائے جاؤ گے، بادشاہ برحق خدا اس سے بالاتر ہے۔

أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَنْ يُّتْرَكَ سُدًى۔ (القیٰمہ 75-36)

ترجمہ: کیا انسان یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ وہ یونہی مہمل چھوڑ دیا جائے گا۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِيْنَ مَا خَلَقْنٰهُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيْقَاتُهُمْ اَجْمَعِيْنَ۔ (الدخان-44-40,38)

ترجمہ: ہم نے زمین اور آسمان کو اور ان چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں کھیل کے طور پر پیدا نہیں کیا ہے ہم نے تو ان کو مقتضائے حکمت کے مطابق پیدا کیا ہے مگر اکثر لوگ نہیں جانتے یقیناً ان سب کے لیے فیصلہ کے دن تک کا وقت مقرر ہے۔

ان آیات میں اسی طرف اشارہ ہے کہ اگر زمین و آسمان کا یہ سارا کارخانہ صرف اس لیے ہے کہ ایک مدت تک چلتا رہے۔ پھر کسی حاصل اور نتیجہ کے بغیر معدوم ہو جائے تو یہ ایک لغو اور عبث فعل ہو گا۔ ایسا فعل ہرگز ایک حکیم کا فعل نہیں ہوسکتا۔ اگر تم مانتے ہو کہ یہ کارخانہ خدا نے بنایا ہے۔ اور خدا تمہارے نزدیک ایک حکیم ہے تو تم کو عقل سے کام لے کر یہ سمجھنا چاہئیے کہ موجودات میں سے کوئی چیز بے مقصد وجود میں آنے والی اور بے حاصل بے نتیجہ معدوم ہو جانے والی نہیں خصوصاً انسان جو کائنات ارضی کا گل سر بد ہے جس کی ذی شعور ہستی اس کائنات ارضی کے تدریجی ارتقاء اور اس کی تمام حرکات وسکنات کا ماحصل ہے۔ جس کو اتنی حکمت کے ساتھ عقل وفکر، بینش ودانش، اختیار وارادہ سے آراستہ کیا گیا ہے۔ اس کی تخلیق کا مقصد اتنا مہمل نہیں ہوسکتا کہ وہ چند برس اس دنیا میں ایک مشین

کی طرح بسر کرے پھر مر کر معدوم ہو جائے۔

اس لیے اس دنیوی زندگی کے بعد ایک اخروی زندگی کا وجود میں آنا ممکن، اغلب، اور اقتضائے حکمت کے مطابق ہے۔ اور عقل اور علم ہم کو اخروی زندگی کے اس تصور پر جو قرآن نے پیش کیا ہے۔ ایمان لانے سے روکتے نہیں۔ بلکہ اس پر آمادہ کرتے ہیں۔ حیات اخروی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض فلسفیانہ مسئلہ ہی نہیں بلکہ انسان کی اخلاقی اور عملی زندگی سے اس کا گہرا تعلق ہے اس کو ماننے سے دنیوی زندگی اور اس کے معاملات کے متعلق انسان کا نقطہ نظر بنیادی طور پر بدل جاتا ہے۔ اس اعتقاد کو تسلیم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے آپ کو ایک ذمہ دار اور جواب دہ ہستی سمجھے اور اپنی زندگی کے تمام معاملات یہ سمجھے ہوئے انجام دے کہ وہ اپنی ہر حرکت اور ہر فعل کے لیے ذمہ دار ہے اور آئندہ زندگی میں اس کو اپنے تمام اعمال کی جواب دہی کرنی ہے۔ اور مستقبل کی سعادت اور شقاوت اس کے حال کی نیکی اور بدی پر منحصر ہے۔

اسلام نے یوم آخر کے عقیدہ کو اپنے ضابطہ اخلاقی اور شرعی نظام کے لیے ایک زبردست پشت پناہ بنا دیا ہے جس میں ایک طرف خیر و صلاح پر عمل کرنے اور شر و فساد سے بچنے کے لیے عقلی ترغیب بھی موجود ہے اور دوسری طرف نیکی پر یقینی جزا اور بدی پر یقینی سزا کا خوف بھی۔ اس ضابطہ اور نظام کو اپنی بقا اور استحکام کے لیے کسی مادی طاقت اور حاکمانہ اقتدار کی

حاجت نہیں ہے بلکہ وہ ایمان بالیوم الآخر کے ذریعے سے انسان کے نفس میں ایک ایسے طاقت ور ضمیر کی تشکیل کرتا ہے جو کسی بیرونی لالچ اور خوف کے بغیر انسان کو اپنے آپ ان نیکیوں کی طرف راغب کرتا ہے۔ جن کو اسلام نے آخری نتائج کے اعتبار سے نیکی قرار دیا ہے اور ان گناہوں سے بچنے کی تاکید کرتا ہے جن کو اس نے آخری نتائج کا لحاظ کرتے ہوئے گناہ ٹھہرا ہے۔

(4) خلافت:

اللہ تعالیٰ کی زمین جو اس کی بے پایاں مملکت کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ اس میں انسان کی حیثیت اس کے نائب کی سی ہے، جس سے اللہ تعالیٰ یہ توقع کرتا ہے کہ اس کی مرضی کے مطابق زندگی گزارے۔ اور اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ صفات سے متصف ہو۔ احساس ذمہ داری کے ساتھ اجتماعی نظام عدل و انصاف قائم کر کے برائی مٹائے اور بھلائی کو فروغ دے۔ اور جمہور کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق چلائے۔

اس عنوان کی وضاحت سے پہلے اس بات کا تعین ضروری ہے۔ کہ اس کائنات میں انسان کی حقیقت کیا ہے۔؟ انسان کو ابتداء ہی سے اپنے متعلق بڑی غلط فہمی رہی ہے۔ اور اب تک اس کی یہ غلط فہمی جاری ہے۔ کبھی وہ افراط پر اترتا ہے تو اپنے آپ کو دنیا کی سب سے زیادہ بلند ہستی سمجھ لیتا ہے۔ غرور تکبر اور سرکشی کی ہوا اس کے دماغ میں بھر جاتی ہے تو کسی کو اپنا مدمقابل بھی

نہیں سمجھتا۔ اور اپنے آپ کو غیر ذمہ دار اور غیر جواب دہ سمجھ کر جبر و قہر کا دیوتا، ظلم و جور اور شر و فساد کا مجسمہ بن جاتا ہے۔ جب تفریط کی جانب مائل ہوتا ہے تو اپنے آپ کو دنیا کی سب سے زیادہ ذلیل ہستی سمجھ لیتا ہے۔ درخت، پتھر، آگ، جانور، چاند سورج تارے وغیرہ غرض ہر اس چیز کے سامنے گردن جھکا دیتا ہے۔ جن کے اندر کسی قسم کی طاقت یا مضرت یا منفعت نظر آتی ہے۔

اسلام نے ان دونوں انتہائی تصوّات کو باطل کر کے انسان کی حقیقت اس کے سامنے پیش کی ہے۔

فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ مِمَّ خُلِقَ مِن مَّاءٍ دَافِقٍ يَخْرُجُ مِن بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ ۔(الطارق-86-7,5)

ترجمہ: انسان اپنی حقیقت تو دیکھے کہ کس چیز سے پیدا ہوا۔ ایک اچھلتے ہوئے پانی سے جو پشت اور سینہ کی ہڈیوں کے درمیان سے کھینچ کر آتا ہے۔

اَوَلَمْ يَرَ الْإِنسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِن نُّطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَنَسِيَ خَلْقَهُ ۔ (یٰسٓ-36-78,77)

ترجمہ: کیا انسان یہ نہیں دیکھتا کہ ہم نے اس کو ایک قطرہ آب سے بنایا ہے اور اب وہ کھلم کھلا حریف بنتا ہے اور ہمارے لیے مثالیں دیتا ہے اور اپنی اصل کو بھول گیا ہے۔

قرآن مجید میں ایسی اور بھی بیسیوں آیات ہیں جن میں انسان کو اس

کی حقیقت یاد دلائی گئی ہے۔ دوسری طرف اسلام نوع انسانی کو یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ اتنا ذلیل بھی نہیں ہے جتنا اس نے اپنے آپ کو سمجھ لیا ہے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا۠ (بنی اسرائیل 17-70)

ترجمہ: اور ہم نے ابن آدم کو عزت بخشی اور ان کو خشکی اور تری میں سواریاں دیں اور ان کو پاک چیزوں سے رزق عطا کیا اور بہت سی ایسی چیزوں پر جو ہم نے پیدا کیں ان کو ایک طرح کی فضیلت عطا کی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ۔ (الحج-22-65)

ترجمہ: (اے انسان) کیا تو نہیں دیکھتا کہ اللہ نے ان سب چیزوں کو جو زمین میں ہیں تمہارے لیے مطیع بنا دیا ہے۔

قرآن مجید میں انسان کو یہ بتایا گیا ہے کہ زمین میں جتنی چیزیں ہیں وہ سب تیری خدمت اور فائدہ کیلئے مسخّر کی گئی ہیں۔ اور آسمان کی بہت سی چیزوں کا یہی حال ہے، سب چیزیں جن کو تو دیکھ رہا ہے تیری خادم ہیں۔ اور تیری منفعت کے لیے ہیں تو ان سب پر فضیلت رکھتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسان نہ اتنا عالی مرتبہ جتنا وہ بزعم خود اپنے آپ کو سمجھتا ہے۔ اور نہ وہ اتنا ذلیل ہے جتنا خود اس نے اپنے آپ کو بنا

لیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آخر اس دنیا میں انسان کا صحیح مرتبہ کیا ہے۔ اس کا جواب سورۃ البقرہ کی آیات نمبر 30 تا 36 قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے۔ جن کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

''اور جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا میں زمین میں ایک خلیفہ (نائب) بنانے والا ہوں تو انہوں نے عرض کیا کہ تو زمین میں اس کو نائب بناتا ہے۔ جو وہاں فساد پھیلائے گا۔ اور خون ریزیاں کرے گا۔ حالانکہ ہم تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح اور تیری تقدیس کرتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا میں وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے اور اس نے آدم علیہ السلام کو سب چیزوں کے نام سکھا دیئے۔ پھر ان فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اگر تم سچے ہو تو ان چیزوں کے نام مجھے بتاؤ۔ انہوں نے کہا پاک ذات ہے تیری ہم اس کے سوا، کچھ نہیں جانتے جو تم نے ہم کو سکھا دیا ہے۔ تو ہی علم رکھنے والا ہے اور تو ہی حکمت کا مالک ہے۔ خدا نے کہا اے آدم علیہ السلام ان چیزوں کے ان فرشتوں کو نام بتاؤ۔ پس جب آدم علیہ السلام نے ان کو اشیاء کے نام بتائے تو خدا نے کہا کہ میں نے تم سے نہ کہا تھا۔ کہ میں سب آسمانوں اور زمین کی سب مخفی باتیں جانتا ہوں اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور چھپاتے ہو اس سب کا علم رکھتا ہوں اور جب ہم نے ملائکہ

سے کہا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو تو ان سب نے سجدہ کیا۔ بجز ابلیس کے کہ اس نے انکار کیا۔ اور تکبر کیا اور نافرمانوں سے ہو گیا۔ اور ہم نے آدم علیہ السلام سے کہا کہ اے آدم علیہ السلام تو اور تیری بیوی جنت میں رہو اور اس میں جہاں چاہو، فراغت سے کھاؤ مگر اس درخت کے پاس بھی نہ بھٹکو کہ تم ظالموں سے ہو جاؤ گے۔ مگر شیطان نے ان کو جنت سے اکھاڑ دیا اور وہ جس خوشحالی میں تھے اس سے ان کو نکلوا دیا۔" (البقرہ 30.2 تا 36)

اس مضمون کو مختلف طریقوں سے قران مجید میں متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔ اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو خدا نے زمین میں اپنا نائب بنایا اس کو فرشتوں سے بڑھ کر علم دیا اس کے علم کو فرشتوں کی تسبیح تقدیس پر ترجیح دی فرشتوں سے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرایا اس طرح ساری ملکوتیت اس کے آگے جھک گئی۔ مگر ابلیس نے انکار کیا اور اس طرح شیطانی طاقتیں انسان کے آگے نہ جھکیں۔ حقیقت میں تو وہ مٹی کا ایک حقیر پتلا تھا۔ مگر خدا نے اس میں جو روح پھونکی تھی۔ اور اس کو جو علم بخشا تھا۔ اس نے اس کو نیابت خداوندی کا اہل بنا دیا۔ فرشتوں نے اس کی اس فضیلت کو تسلیم کر لیا اور اس کے آگے جھک گئے لیکن شیطان نے اس کو تسلیم نہ کیا۔ اس جرم میں شیطان پر لعنت بھیجی گئی مگر اس نے قیامت تک کے لیے مہلت مانگ لی کہ انسان کو بہکانے کی کوشش کرے۔ چنانچہ

شیطان نے انسان کو بہکایا جنت سے نکلوایا اور اس وقت سے انسان اور شیطان میں کشمکش جاری ہے خدا نے انسان سے کہہ دیا کہ جو ہدایت میں تجھے بھیجوں۔ اس کو مانے گا تو جنت میں دوبارہ داخل ہو جائے گا اور اپنے ازلی دشمن شیطان کا کہا مانے گا۔ تو تیرا ٹھکانہ دوزخ ہو گا۔

اس توضیح سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ انسان کی حیثیت اس دنیا میں خدا کے خلیفہ کی ہے۔ خلیفہ کہتے ہیں نائب کو نائب کا کام یہ ہے۔ کہ وہ جس کا نائب ہے اس کی اطاعت کرے وہ نہ تو اس کے سوا کسی اور کی اطاعت کر سکتا ہے کہ ایسا کرے تو باغی سمجھا جائے گا۔ اور نہ وہ اس امر کا مجاز ہے کہ اپنے آقا کی رعیت کو خود اپنی رعیت بنا لے کہ اگر ایسا کرے گا تب بھی باغی قرار دیا جائے گا۔ اس کو جس جگہ بنایا گیا ہے وہاں وہ اپنے آقا کی املاک میں تصرف کر سکتا ہے ان کو استعمال کر سکتا ہے اس کی رعیت پر حکومت کر سکتا ہے اس سے خدمت لے سکتا ہے مگر اس حیثیت سے نہیں کہ وہ خود آقا ہے بلکہ اس حیثیت سے کہ وہ اپنے آقا کا نائب ہے اور جتنی چیزیں اس کے زیر حکم ہیں ان میں اپنے آقا کا امین ہے۔ اس کی املاک پر اس کی رعیت پر حکومت کرنے میں اس کے بنائے ہوئے قوانین پر کاربند ہو اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو نائب نہیں باغی ہو گا۔ مستحق انعام نہیں مستوجب سزا ہو گا۔

فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُونَ
وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ

فِيهَا خَالِدُونَ ○ (البقرہ-2-39,38)

ترجمہ: تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی ایسے لوگوں کے لیے کسی سزا کا خوف اور کسی نا مرادی کا رنج نہیں ہے اور جنہوں نے میری نافرمانی کی اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں۔ جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

انسان اپنی اصل کے اعتبار سے ایک حقیر مخلوق ہے۔ مگر اس کو روئے زمین میں جو عزت حاصل ہوئی ہے وہ اس روح کی بنا پر ہے جو اس میں پھونکی گئی ہے اور اس نیابت الٰہی کی بنا پر ہے جو اسے زمین میں عطا کی گئی ہے۔ اب اس عزت کی حفاظت اس بات پر منحصر ہے کہ وہ شیطان کی پیروی کر کے اپنی روح کو گندہ نہ کر دے اور اپنے آپ کو نیابت کے درجے سے گرا کر بغاوت کے مرتبے پر نہ لے جائے۔ ملکوتی طاقتیں انسان کے نائب خدا ہونے کو تسلیم کر چکی ہیں۔ مگر شیطانی طاقتیں اس کی نیابت کو تسلیم نہیں کرتیں۔ انسان اگر دنیا میں نیابت الٰہی کا حق ادا کرے گا اور خدا کی ہدایت پر چلے گا تو ملکوتی طاقتیں اس کا ساتھ دیں گی۔

نوع انسانی کا کوئی مخصوص فرد یا گروہ نائب خدا نہیں ہے بلکہ پوری نوع انسانی نیابت الٰہی کے منصب پر سرفراز کی گئی ہے۔ اور ہر انسان خلیفہ خدا ہونے کی حیثیت سے دوسرے انسان کے برابر ہے۔ نیابت اور امانت کا منصب ہر انسان کو شخصاً شخصاً حاصل ہے اس میں کوئی مشترک ذمہ داری

نہیں ہے اس لیے ہر شخص اپنی اپنی جگہ اس منصب کی ذمہ داریوں کے بارے میں جوابدہ ہے انسان جب تک زمین میں ہے اور جب تک مٹی کے پتلے (جسد خاکی) اور خدا کی طرف پھونکی ہوئی روح میں تعلق باقی ہے۔ اس وقت تک وہ خدا کا نائب ہے اس تعلق کے منقطع ہوتے ہی وہ خلافت ارضی کے منصب سے الگ ہو جاتا ہے اس کے عرصہ نیابت کے اعمال وافعال کی جانچ پڑتال ہوگی اور اس کی سپرد جو امانت کی گئی تھی اس کا حساب کتاب ہوگا۔

وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِىْ مَا اٰتَاكُمْ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (الانعام۔6-166)

ترجمہ: وہ اللہ ہی ہے۔ جس نے تم کو زمین میں نائب بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض سے اونچے درجے دیئے تاکہ جو کچھ اس نے تم کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔ بیشک تمہارا پروردگار جلد عذاب دینے والا ہے اور بے شک وہ بخشنے والا مہربان بھی ہے۔

پس جب انسان کو خدا کا خلیفہ اور نائب قرار دیا گیا ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ انسان خدائی نیابت وخلافت کا پورا حق اس وقت ادا کر سکتا ہے جب اس کی مخلوق کے ساتھ برتاؤ کرنے میں اس کی روش بھی ویسی ہو جیسی

خود خدا کی روش اپنی مخلوق کے ساتھ ہے۔ یعنی جس شان ربوبیت کے ساتھ خدا اپنی مخلوق کی خبر گیری اور پرورش کرتا ہے۔ ویسی ہی ان کے ساتھ انسان بھی اپنے محدود دائرہ عمل میں ان چیزوں کی خبر گیری اور پرورش کرے جو اللہ نے اس کے قبضہ قدرت میں دے رکھی ہیں۔ ہر انسان بحیثیت نائب اپنے اس دائرہ کار میں رہتے ہوئے جو اعمال بھی کرے گا۔ اس کے احتساب کا بندوبست بھی کر دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَاَن لَّیۡسَ لِلۡاِنسَانِ اِلَّا مَا سَعٰیo وَاَنَّ سَعۡیَهٗ سَوۡفَ یُرٰیo ثُمَّ یُجۡزٰهُ الۡجَزَآءَ الۡاَوۡفٰیۙ وَاَنَّ اِلٰیo رَبِّكَ الۡمُنۡتَهٰی۔ (النجم-53-42,39)

ترجمہ: اور یہ کہ انسان کو اتنا ہی ملے گا جتنی اس نے کوشش کی ہے۔ اور اس کی کوشش عنقریب دیکھی جائے گی۔ اور پھر اس کو پورا پورا بدلہ ملے گا۔ اور یہ کہ آخر کار سب کو تیرے رب کے پاس پہنچنا ہے۔

فَمَن یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَیۡرًا یَّرَهٗ وَمَن یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ۔ (الزلزال 99-8,7)

ترجمہ: پس جو شخص ذرہ برابر نیک عمل کرے گا اس کا نتیجہ دیکھ لے گا اور جو ذرہ برابر برا عمل کرے گا اس کا نتیجہ بھی دیکھ لے گا۔

اس ساری بحث کا ماحصل یہ ہے۔ کہ اسلام نے زندگی کے تمام تصوّرات میں نیابت الٰہی کا جو تصوّر پیش کیا ہے۔ وہ فطرت اور حقیقت کے عین مطابق ہے جس میں دنیا اور انسان کے تعلق کو ٹھیک ٹھیک ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ اسلام اس امر کا ٹھیک ٹھیک تعین کرتا ہے۔ کہ دنیا میں انسان کا حقیقی مرتبہ کیا ہے اور دنیا اور انسان میں کس نوع کا تعلق ہے؟ اور انسان دنیا کو برتے تو کیا سمجھ کر برتے؟ وہ یہ کہہ کر انسان کی آنکھیں کھول دیتا ہے۔ کہ تو عام مخلوق کی طرح نہیں ہے بلکہ روئے زمین پر رب العالمین کا ذمہ دار وائسرائے ہے۔ دنیا اور اس کی طاقتوں کو تیرے لیے مسخر کیا گیا ہے تو سب کا حاکم اور صرف ایک کا محکوم ہے۔ تجھے تمام مخلوقات پر عزت و شرف حاصل ہے مگر اس عزت کا استحقاق تجھے اس وقت حاصل ہوسکتا ہے جب تو اس کا مطیع اور فرمانبردار ہو۔ جس نے تجھے نیابت کا منصب عطا کر کے دنیا میں شرف بخشا ہے۔ دنیا میں تو اس لیے بھیجا گیا ہے۔ کہ اس کو برتے اور اس میں تصرّف کرے۔ پھر تو اس دنیا کی زندگی میں جس طرح صحیح یا غلط عمل کرے گا۔ اس کے جو اچھے یا برے نتائج مرتب ہوں گے جنہیں تو بعد کی زندگی میں دیکھے گا۔ لہٰذا دنیوی زندگی کی اس تھوڑی سی مدت میں تجھ کو اپنی شخصی ذمہ داری اور مسئولیت کا ہر لمحہ احساس رہنا چاہیئے۔ اور کبھی اس سے غافل نہ ہونا چاہیئے۔ کہ جو چیزیں رب العالمین نے اپنے نائب کی حیثیت سے تیری

امانت میں دی ہیں۔ ان سب کا تجھ سے پورا پورا حساب لیا جائے گا۔(1)

(5) عالمگیر اخوت:

اسلام اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ سب انسان ایک ماں باپ یعنی آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام کی اولاد ہیں۔ اس لیے سب برابر اور آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ جن میں رنگ ونسل کی رو سے کسی کو برتری حاصل نہیں۔ عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر بجز تقویٰ کے کوئی فضیلت نہیں۔ سب مخلوق اللہ کی عیال ہے۔ اور اس کو اس کے بنیادی حقوق سے محروم رکھنا اللہ کے نزدیک جرم ہے۔

انسان مدنی الطبع ہے۔ اور اس میں مل جل کر زندگی بسر کرنے کا فطری رجحان پایا جاتا ہے اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے وہ دوسروں کا محتاج ہے۔ انسان کا یہی فطری رجحان ہی معاشرہ کے قیام کا سبب بنا ہے۔ انسانی معاشرہ کے قیام میں اس کی ضرویات زندگی کی تکمیل، قرابت داری، مذہب اور قیام امن کی ضرورت بنیادی عوامل ہیں۔ جو انسان کو ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ انسانی معاشرہ ارتقاء پذیر ہے پہلے انسانوں کی زندگی سادہ تھی۔ رفتہ رفتہ بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مختلف وسائل معلوم ہوتے گئے جوں جوں

(1) اسلامی تہذیب اور اس کے اصول ومبادی۔ ص۔ 51۔

انسانی ضروریات بڑھتی گئیں انسان کو ایک دوسرے کے تعاون کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ اس طرح ضروریات کی تکمیل کی بنا پر جماعتی زندگی میں تنظیم شروع ہوگئی معاشرتی زندگی کی تنظیم میں قرابت داری، مذہب اور امن وامان کی ضرورت نے اہم کردار ادا کیا۔

رسول اکرم ﷺ نے جس معاشرہ کی بنیاد رکھی اس کی پہلی خصوصیت ہی وحدت نسل انسانی ہے اسلام تفریق بین الناس کا شدید مخالف ہے قومی، نسلی اور انسانی امتیازات کو جڑ سے کاٹتا ہے۔ نسل انسانی کی وحدت کا نظریہ وہ نظریہ ہے جس کی نظیر دوسرے انبیاء کرام کی تعلیمات میں نہیں ملتی یہی وہ نظریہ ہے جس پر انسانی معاشرہ میں امن وامان کی عمارت کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے۔

يَا اَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّن نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً۔ (النساء-4-1)

ترجمہ: اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا ہے اور اسی سے اس کا جوڑ پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ط

(یونس-10-19)

ترجمہ: اور سب لوگ ایک ہی امت ہیں اور وہ باہم جھگڑتے ہیں۔

وَاَنَّ هَذِهِ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَاحِدَةً وَاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ
وَتَقَطَّعُوا اَمْرَهُم بَيْنَهُمْ كُلٌّ اِلَيْنَا رَاجِعُونَ۔

(الانبیاء21-93,92)

ترجمہ: اور یہ تمہاری قوم ایک ہی قوم ہے اور میں تمہارا رب ہوں۔ سو میری بندگی کرو مگر انہوں نے اپنے معاملہ کو آپس میں قطع کردیا۔ سب ہماری طرف لوٹ کر آنے والے ہیں۔

رسول کریم ﷺ نے وحدت نسل انسانی کا ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

الخلق عيال الله فاحب الخلق الى الله من احسن الى عياله۔

ترجمہ: ساری مخلوق عیال اللہ ہے۔ اور اللہ سب سے زیادہ محبت اس سے کرتا ہے جو اللہ کی مخلوق کو سب سے زیادہ چاہتا ہے۔(1)

انسانیت کے درمیان تمام امتیازات کو مٹانے کے لیے پہلا مظاہرہ مسجد میں ہوتا ہے جہاں امیر غریب کے ساتھ خادم آقا کے ساتھ دوش بدوش کھڑا ہوتا ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول کریم ﷺ نے وحدت نسل انسانی کے پیغام کو دہراتے ہوئے فرمایا۔

لوگو! ہاں بے شک تمہارا رب ایک ہے۔ اور بے شک تمہارا باپ ایک

(1) بیہقی کتاب الایمان۔

ہے۔ ہاں عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب سے۔(1)

اسلام نے نسل انسانی کو وحدت فکر کی سلک میں منسلک کرنے کے لیے ایسے اصول وضع کیے ہیں جن کی پابندی انتشار فکر سے محفوظ رکھتی ہے۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ط (البقرہ-2-213)

ترجمہ: سب لوگ ایک ہی جماعت تھے۔ پس اللہ نے نبیوں کو بھیجا خوش خبری دینے والے، اور ڈرانے والے اور ان کے ساتھ حق کے ساتھ کتاب اتاری تاکہ لوگوں میں ان باتوں کا فیصلہ کرے جن میں باہم اختلاف کرتے ہیں۔

اسلامی معاشرہ میں انسان ہونے کی حیثیت سے سب برابر ہیں نہ تو امارت کسی کے لیے وجہ تکریم ہے۔ نہ غربت وجہ ذلت، اور نہ کوئی نسل کے لحاظ سے مسند صدارت پر بیٹھنے کا زیادہ مستحق ہو سکتا ہے۔ دنیا کا ہر انسان ہونے کے لحاظ سے احترام کا مستحق ہے ارشاد الٰہی ہے وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ اٰدَمَ۔ یعنی ہم نے آدم علیہ السلام کے بیٹوں کو عزت بخشی ہے اب رہا یہ کہ معاشرہ

(2) بخاری شریف

میں لوگوں کی عزت اور ذلت کا معیار کیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا یعنی ہر ایک کا درجہ اس کے کاموں کے لحاظ سے مقرر کرو۔ دوسری جگہ آتا ہے اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ۔ تم میں سب سے زیادہ عزت کا مستحق اللہ کے نزدیک وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔

اسلام پہلا مذہب ہے جس نے عالمگیر برادری کا تصوّر پیش جس کی نظیر دنیا کے کسی مذہب میں نہیں پائی جاتی۔ نسل انسانی کی وحدت کا پیغام صرف نبی اکرم ﷺ نے سنایا کہ تمام مخلوق ایک ہی اصل کی مختلف شاخیں اور ان میں کوئی تفریق نہیں ہے۔ ہمارے اس دور میں عالمگیر برادری کا نظریہ اسی آواز کی بازگشت ہے جو اس سے چودہ سو سال قبل ایک اُمی نبی ﷺ نے خدا سے وحی پا کر مکہ کی بے آب وگیاہ وادی میں بلند کی تھی۔

دوسرے مذاہب کے مقابلے میں اسلام میں عالمگیر اخوت کے فروغ کی جو صلاحتیں موجود ہیں وہ کسی دوسرے مذاہب میں نہیں۔ جس کا اعتراف غیر مذہب کے علماء اور مُستشرقین نے بڑے واضح الفاظ میں کیا ہے۔ بالوبین چندر پال کہتا ہے۔

''اسلام نے اخوت اور برادانہ روابط پر جس قدر زور دیا ہے۔ اور جس شدومد سے اس پر عمل پیرا ہوا اس کی مثال دنیا کا کوئی اور مذہب پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس میں ہندوؤں کی طرح ذات پات کا رواج موجود نہیں۔ یہ مسلمانوں کی انتہائی ہمدردی اور خدا ترسی ہی تھی جس نے

ہندوستان جیسے عظیم الشان ملک کی مذہبی زندگی اور خیالات میں انقلاب برپا کر دیا۔ اسلام نے سیاسی طور پر بنی نوع انسان کو ایسے حقوق عطا کیے جو رومیوں اور دوسری اقوام نے صدیوں میں بھی اپنی رعایا کو نہ دیئے تھے۔ اسلام نے ٹیکس محدود کر دیا۔ قانوناً اب انسانوں کو ایک دوسرے کے مساوی بنا دیا حکومت خود اختیاری کے اصول رائج کیے۔ اور بادشاہوں کے اختیارات پر پابندیاں عائد کر دیں۔''(1)

شری راج دید پنڈت گدادھر پرشاد رئیس اعظم الہ آباد کہتا ہے۔

''میں ایک راسخ العقیدہ ہندو ہوں۔ لیکن میں نے ہندو، عیسائی اور اسلامی مذاہب کے بانیوں کے حالات زندگی کو اپنی بہترین توجہ کا خراج دیا ہے۔ اور میں بانگ دہل اعلان کرتا ہوں کہ میری رائے میں جس مذہب کو اخوت باہمی یا اخلاق وتہذیب اور دولت اتحاد کی فراوانی کثرت سے عطا کی گئی ہے۔ وہ مذاہب کا سردار ''اسلام'' ہے۔ اسلام کی فیاضی اور کشادہ دلی اس کا امتیازی نشان ہے۔ وہ بلحاظ اس بات کے کہ کوئی امیر ہے یا غریب سب کو اپنی آغوش میں پناہ دیتا ہے۔ اور اس کے دروازے سب کے لیے کھلے ہیں۔ ہر خیال اور رنگ کے انسان اس کے زیر سایہ آرام و راحت کی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ اچھوت پن کو دور کرنے کی طاقت اسلام اور صرف اسلام میں ہے اس کے علاوہ کوئی اور مذہب اس کو دور کرنے کی

(1) اسلام اور سیاسی، معاشرتی اور معاشی نظریات بحوالہ اسلام اور پیغمبر اسلام غیروں کی نظر میں (مولف خلیفہ عبدالرحمان) ص452۔

طاقت نہیں رکھتا۔''(1)

ریورنڈ باسورتھ سمتھ لکھتا ہے۔

''یہ اسلام وہ مذہب ہے جو تمام رنگ ونسل اور مدارج کے لوگوں کو اپنے اندر جذب کر کے ان میں احساس اخوت پیدا کرتا ہے۔''(2)

ایڈورگن لکھتا ہے۔

''ایک ناقابل فراموش انقلاب جس نے کرۂ ارض کی تمام قوموں پر ایک نئے اور دائمی طرز کی اثر اندازی کی ہے۔ رسول کریم ﷺ نے عالمگیر برادری اور مساوات کا جو کلی اصول پیش کیا ہے۔ وہ اتنا عالم آشکارا ہے کہ اس کی تشریح کی ضرورت ہی نہیں۔(3)

مشہور عالمی مؤرخ پروفیسر ٹوائن بی (Toynbee) نے رنگ و خون کے امتیازات کے انسداد کو عالمی تہذیب پر اسلام کا ایک نہایت گہرا اور گران قدر احسان قرار دیا ہے۔

(6) آزادی:

اسلام کی رو سے آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے۔ چھوٹے بڑے، امیر۔غریب۔ مالک۔ نوکر سب اللہ کے بندے اور اس کے تابع فرماں ہیں۔ مسلک، ضمیر اور رائے کے معاملے میں کوئی جبر نہیں۔ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ دوسروں کی آزادی سلب کرے۔

---

(1) ایضاً 453

(2) اسلام اور معاشرتی، سیاسی اور معاشی نظریات ص 453 بحوالہ لیکچرز آن محمد اینڈ محمڈنزم۔

(3) اسلام اور معاشرتی، سیاسی اور معاشی نظریات ص 453۔

آزادی کا عام مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ ہر فرد اپنے دائرہ عمل میں آزاد ہو۔ اور اس کے کسی کام پر کوئی قدغن نہ لگائی جائے جس طرح وہ چاہے کام کرے لیکن ہر شخص کو اس کے دائرہ عمل میں آزادی بخش دی جائے تو اس کا انجام طوالف الملوکی ہوگا۔ آزادی کا ایک مفہوم یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ آزادی سے مراد ایسی فضا ہے جس میں افراد کو اپنی صلاحیتوں کی نشو ونما کا مناسب موقع ملے۔ آزادی کے افعال کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ افعال ہیں۔ جن کا تعلق انسان کی اپنی ذات سے ہے اور ان کا کوئی اثر دوسروں پر نہیں پڑتا۔ دوسرے وہ افعال ہیں۔ جن کا تعلق دوسروں کے ساتھ ہے اور ان کا اثر دوسروں پر پڑتا ہے۔ ان افعال پر کسی قسم کی پابندی عائد نہ کی جائے جس کا تعلق فاعل کی ذات سے ہے۔ لیکن جن کا تعلق دوسروں کے ساتھ ہو ان پر پابندی عائد کرنا ضروری ہے۔ اگر پابندی عائد نہ کی گئی تو معاشرہ میں بدامنی پیدا ہو جائے گی بلکہ اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ معاشرہ میں ایسے مواقع موجود ہوں جن کے ذریعے ہر شخص کو اپنی صلاحتیں بروئے کار لانے کا پورا پورا موقع میسر ہو۔

مفکرین نے آزادی کے مفہوم کو متعین کرنے میں افراط و تفریط سے کام لیا ہے لیکن اسلام نے جو دین فطرت ہے۔ راہ اعتدال اختیار کر کے آزادی کی صحیح حدود متعین کی ہیں۔ اسلام انسان کو ان افعال میں بھی بے لگام نہیں چھوڑتا جن کا دوسروں پر اثر نہیں پڑتا۔ اسلام ان تمام افعال پر

پابندی عائد کرتا ہے جن کا تعلق انسان کی اپنی ذات اور دوسروں کے لیے نقصان دہ ہو۔ کیونکہ معاشرہ اور فرد کا باہمی تعلق نہایت ہی گہرا ہے۔ جب فرد کی صحیح نشو نما نہیں ہوگی تو معاشرہ میں لازماً بگاڑ پیدا ہوگا۔ ارشاد الٰہی ہے:

وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَۃً اَوْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَھُمْ ذَکَرُوا اللّٰہَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِھِمْ (آل عمران 3-135)

ترجمہ: اور وہ جس وقت برا کام کرتے ہیں۔ اور اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھتے ہیں اللہ کو یاد کرتے ہیں پھر اپنے قصوروں کے لیے بخشش مانگتے ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ٥ اِنَّمَا یَاْمُرُکُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ (البقرہ۔ 169,168)

ترجمہ: اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو۔ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ وہ یقیناً تمہیں برائی اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے۔

سوء سے مراد وہ افعال ہیں۔ جو انسان کی اپنی ذات سے تعلق رکھتے ہیں اور اس کی ذات کے لیے نقصان دہ ہیں۔

فحشاء سے مراد وہ برے افعال ہیں جو دوسروں پر اثر انداز ہوتے ہیں اسلام نے دونوں قسم کے افعال کو شیطان کی طرف منسوب کیا ہے اور ان سے باز رہنے کی تلقین کی ہے۔ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے

انسان کی گردن کو ہر قسم کی غلامی سے نجات دی ہے اور ہر قسم کی آزادی کی نعمتوں سے نوازا ہے

وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَاهُمْ وَالْاَغْلَالَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔

(اعراف۔7-157)

ترجمہ: اور ان پر سے بوجھ اور طوق جو ان کے (سر پر) اور (گلے میں تھے) اتارتے ہیں۔

قرآن مجید کا یہ اعلان اس وقت ہوا جب دنیا آزادی کے مفہوم اور حقوق انسانی کے نام سے بھی واقف نہیں تھی۔ یہ وہ پہلی آواز ہے جو عرب کے ریگستانوں سے اٹھی اور دنیا کے چاروں گوشوں میں گونج اٹھی۔ آج چودہ سو سال بعد اسی آواز سے متاثر ہو کر مفکرین آزادی آزادی پکار رہے ہیں دنیا کی سب سے بڑی انجمن ''اقوام متحدہ'' نے انسانی حقوق کا عالمی منشور شائع کیا عالمی منشور کی تمام دفعات دراصل آسمانی آواز کی بازگشت ہیں۔ جب پوری دنیا غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی تو اس تاریک دور میں ایک اُمی نبی ﷺ نے ہر قسم کی غلامی سے مخلوق خدا کو آزاد کر کے کامل حریت کا سبق پڑھایا۔

اسلام نے بنی نوع انسان کو آزادی کا جو تحفہ دیا اس کا پہلا ثمر حریت فکر و نظر ہے۔ اسلام حریت فکر کا علمبردار مذہب ہے اور عقل کو ہر قسم اوہام اور اندھی تقلید سے نجات دلاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بار بار عقل سے کام لینے اور غور و فکر کرنے کی دعوت دی ہے۔ اور یہاں تک کہا کہ جو لوگ عقل و

شعور سے کام نہیں وہ چوپائیوں کی مانند ہیں۔ رسول کریم ﷺ کا فرمان ہے:

(1) انسان کا دین اس کی عقل ہے اور جس کا کوئی دین نہیں اس کو عقل نہیں۔

(2) حسب عقل لوگ ایک دوسرے سے دنیا اور آخرت میں فضیلت حاصل کریں گے۔

(3) جب اللہ کسی کو بھلائی دینے کا ارادہ کرتا ہے۔ تو اس کو دین میں سمجھ عطا کر دیتا ہے۔

اسی طرح اسلام وہ پہلا دین ہے جس نے مکمل طور پر عقیدہ کی آزادی کی ضمانت دی ہے۔ اسلامی قانون کے مطابق ہر انسان آزاد ہے کہ وہ جو چاہے عقیدہ اختیار کرے اور کسی کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ اسے عقیدہ کو ترک کرنے پر مجبور کرے۔

لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ...... دین میں کوئی زبردستی نہیں

اسلام نے معروف قول کے اظہار کی کامل آزادی ہے لیکن وہ قول جو معاشرہ پر برا اثر ڈالتا ہے۔ اس سے روکا ہے تاکہ سماج میں بگاڑ پیدا نہ ہو۔ جہاں اسلامی قانون حریت قول کا علمبردار ہے وہاں انسان کی معاشی آزادی، معاشرتی حریت اور سیاسی حریت کا بھی ضامن ہے۔

اسلام میں فرد کی آزادی کا دائرہ دو اہم نکات پر محیط ہے۔ ایک فرد کی شخصیت کی نشوونما اور دوسرا انفرادی جواب دہی کا احساس۔ یہ دونوں امور یعنی دنیا میں انسانی شخصیت کی نشوونما۔ اور آخرت میں انسان کی جواب دہی۔ یہ دونوں امور اس بات کے متقاضی ہیں۔ کہ دنیا میں فرد کو حریت

حاصل ہو۔ اگر کسی معاشرہ میں فرد کو اپنی پسند کے مطابق اپنی شخصیت کی تکمیل کے مواقع حاصل نہ ہوں تو اس کے اندر کی شخصیت ٹھٹھر کر رہ جاتی ہے اس کی صلاحیتیں اور قوتیں دب کر رہ جاتی ہیں تو اس بات کی جواب دہی کے ذمہ دار معاشرے کے وہ لوگ ہوں گے۔ جو اس قسم کے اجتماعی نظام کو بنانے اور چلانے کے ذمہ دار ہیں۔

اسلام فرد کی آزادی کا جو نظریہ پیش کرتا ہے۔ وہ ایک راہ اعتدال ہے۔ جس میں نہ صرف انسانی شخصیت کے نشوو ارتقا کے مواقع موجود ہیں بلکہ اس کے ساتھ ہر انسان اپنی ذاتی افعال کی جواب دہی کا بھی ذمہ دار ہے۔

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر صاحب نے اس نقطہ نظر کو ایک نئے انداز میں پیش کیا ہے۔

''اس میں شک نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی تحریک اسلام کا ایک بنیادی مقصد انسان کو استحصالی قوتوں سے نجات دلانا اور اسے معاشرے میں آزادی اور عزت کا حسین مقام دلانا تھا۔ اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوئی۔ لیکن معاشرتی زندگی کے تقاضوں اور ذمہ داریوں کی نوعیت کچھ ایسی ہے۔ کہ آزادی نہ تو مطلق وغیر محدود ہو سکتی تھی اور نہ ہوئی۔ جس طرح انسان کی سوچ۔ اختیار، انتخاب وقوت، قابلیت اور استعداد محدود ہے اسی طرح اس کی آزادی بھی محدود ہونی چاہئے تھی۔ اور ہے۔ انسان میں جنگلی زندگی سے متمدن ومہذب زندگی کی طرف سفر کے دوران ایک تو معاشرتی زندگی کی ذمہ داریوں کا اور دوسرے اپنی آزادی کی حدود کا تعین وتحدید کرتا ہے۔ یہ تعین اور

تحدید ہی دراصل آزادی کا وہ حصار ہے جو اس کی حفاظت و احترام کا ضامن ہے اس اصول کا اطلاق فرد اور قوم دونوں کی آزادی پر ہوتا ہے۔(1)

(7) امر و نواہی:

اللہ کی مرضی یہی ہے کہ اس کی مخلوق نیکی کی راہ پر گامزن ہو اور برے کاموں سے اجتناب کرے۔ اس لیے ہر انسان نیکی کے کاموں میں تعاون اور برے کاموں سے حتی الامکان روکے۔ زندگی بسر کرنے کے سیدھے، سچے طریقوں کی ترویج و فروغ کا اہتمام کیا جائے۔ اور ہر انسان دوسروں کے لیے وہی پسند کرے جو اپنے لیے کرتا ہے۔

انسان ایک عالم صغیر ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے بے شمار قوتیں اور صلاحیتیں ودیعت کر رکھی ہیں۔ وہ مخفی قوتیں صرف معاشرہ ہی میں نشو ونما پا سکتی ہیں۔ جس طرح انسان اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ایک دوسرے کا محتاج ہے اسی طرح ہر انسان اپنی مخفی قوتوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے ایک اچھے معاشرہ اور بہتر سوسائٹی کا بھی حاجت مند ہے۔ جس طرح درخت دراصل ایک چھوٹا سا بیج ہے۔ اس بیج میں ہی شاخیں، تنے۔ پتے پھول اور پھل وغیرہ بننے کی صلاحیتیں پیدا کر رکھی ہیں۔ جب اس بیج کو وہ ماحول دے دیا جائے تو اس کی تمام مخفی قوتیں ظاہر ہو جاتی ہیں اسی طرح انسان کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے لیے ایک ایسا ماحول جس میں اپنی پوشیدہ قوتوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکے۔

(1) پیغمبر اعظم و آخر۔ص۔۲٦

وہ ماحول صرف سوسائٹی میں ہی میسر آ سکتا ہے۔ پس معاشرہ کا سب سے اہم مقصد افراد کی صلاحیتوں کی آبیاری کرنا ہے لیکن ہمیں یہ بات بھی پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ انسان کی فطرت صرف مثبت صلاحیتوں کا مجموعہ نہیں بلکہ اس میں بہت ساری دوسری منفی جبلتیں بھی موجود ہیں۔ جو معاشرہ کے ارتقاء اور نشوونما میں رکاوٹیں کھڑی کرتی رہتی ہے۔ معاشرتی معروفات کے فروغ اور منکرات کے انسداد کے لیے اسلام نے بڑی تاکید کی ہے۔ تاکہ پرامن معاشرتی ارتقاء کا عمل جاری رہے اور ہر انسان کو اپنی معروف صلاحیتوں کو ظاہر کرنے کا پورا پورا موقع ملتا رہے۔

چنانچہ اسلام معاشرہ کے لیے ایک ایسا ضابطہ اخلاق مقرر کرتا ہے جس سے کسی کو بھی سرمو تجاوز کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ صرف اس ضابطہ اخلاق کو خود اپنانا ہی لازمی قرار نہیں دیتا بلکہ یہ بھی حکم دیتا ہے کہ جو شخص اس سے انحراف کرنے کی طرف مائل ہو اس کو روکا جائے۔ یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ساتھ ہی معاشرہ میں حسن اور نظم پیدا ہو سکتا ہے۔ اس کے بغیر معاشرہ میں فساد اور بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (المائدہ۔5-2)

ترجمہ: اور نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے سے تعاون نہ کرو۔

معاشرہ میں معروف کے فروغ اور اصلاح کی ذمہ داری اس امت

پر ڈالی گئی ہے۔ اور اسے ایک بہترین امت قرار دے کر اس کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے تا کہ تبلیغ و اصلاح کا یہ عمل ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جاری رکھا جائے۔

ارشاد الٰہی ہے:

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ (آل عمران 3-110)

ترجمہ: تم سب سے اچھی جماعت ہو۔ جو لوگوں کی بھلائی کے لیے پیدا کی گئی ہو تم اچھے کاموں کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو۔

اس امر کی مزید تاکید کرتے ہوئے ارشاد الٰہی ہوتا ہے:

وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ۔ (آل عمران۔3-104)

ترجمہ: اور چاہیے کہ تم میں سے ایک جماعت ہو جو بھلائی کی طرف بلائیں اور اچھے کاموں کا حکم دیں اور برے کاموں سے روکیں۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ضمن میں رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

(1) ''تم میں سے جو کوئی برائی دیکھے تو اس کو ہاتھ سے روکے اگر اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اپنی زبان سے اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو اپنے دل میں برا منائے اور یہ کمزور ترین ایمان ہوگا۔(1)

(2) قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے۔ کہ تمہیں ضرور نیکی کی ہدایت کرنا ہوگی اور برائی سے روکنا ہوگا۔ ورنہ عین ممکن

(1) مشکوۃ المصابیح۔

ہے کہ اللہ تم پر اپنی طرف سے عذاب نازل فرمائے۔ پھر تم اسے پکارو گے اور تمہاری پکار کا جواب نہ دیا جائے گا۔(1)

یہ وہ اساسی تصورات ہیں جن سے ہم بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ اسلامی نظام تعلیم کے مقاصد کیا ہیں؟ اور رسول اللہ ﷺ نے جس تعلیمی انقلاب کی بنیاد رکھی۔ اس میں خداوند قدوس کی توحید۔ رسالت۔ عالمگیر اخوت۔ آزادی فکر و نظر اور انسانی معاشرہ میں پر امن بقائے باہمی کے لیے نیکی کی ترویج واشاعت اور برائی سے اجتناب شامل ہیں۔ ان تصورات کی بنیاد پر اسلام ایک ایسا معاشرہ چاہتا ہے جس میں ہر انسان کے بنیادی حقوق کا تحفظ ہو۔ اور ہر انسان اپنی صلاحیتوں۔ میلانات اور رجحانات کے مطابق ترقی کر کے معاشرہ میں اپنا مقام حاصل کرے۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنے آقا اور بندے کا جو تعلق ہے۔ اس کے پیش نظر اپنی آخرت کو بھی سنوار سکے۔ ان جملہ مقاصد کی تکمیل کے لیے حضور اکرم ﷺ نے جس تعلیمی نظام کی بنیاد رکھی اس کو ایک انقلاب کی حیثیت حاصل تھی۔ جن کا تفصیلی ذکر اگلی سطور میں ہوگا۔

(1) مشکوٰۃ المصابیح۔

تعلیمی انقلاب

گزشتہ صفحات میں بعثت نبوی ﷺ سے قبل یا تقریباً اس عہد کی دنیا کے حالات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت انسانیت نہایت مخدوش حالات سے دوچار تھی۔ ان حالات کے پیش نظر جس ہمہ گیر انقلاب کی ضرورت تھی وہ انقلاب برپا ہو چکا تھا۔ جس کا ذکر بھی ''اسلام ایک ہمہ گیر انقلاب'' کی ذیلی عنوان کے تحت گزر چکا ہے۔ انہی صفحات میں ہم نے اخلاقی، مذہبی اور روحانی طور پر پس ماندہ انسانیت کا جو نقشہ پیش کیا ہے اس سے قطع نظر اس عہد کی تعلیمی حالت بھی ضمناً بیان کی ہے۔ مذکورہ دگرگوں حالت کے پیش نظر اس عہد میں علم کی اہمیت و افادیت اور اس کی فضیلت و اہتمام کے اجاگر نہ ہونے کی وجہ کوئی سربستہ راز نہیں۔ جب اخلاقی اور روحانی انحطاط کا دور دورہ ہو تو علم وفن تو ایک نہایت ہی کم تر توجہ طلب پہلو رہ جاتا ہے۔ تعلیم ہی کو اگر انسانیت کی فلاح و بہبود اور اصلاح کا ذریعہ سمجھا جائے تو اس کے لیے بھی صرف اور صرف اسلام نے محسوس کیا۔ اور داعی اسلام محمد رسول اللہ ﷺ نے تعلیمی انقلاب کی بھی اس ہمہ گیر انقلاب کے ساتھ بنیاد رکھی جو آگے چل کر انسانیت کی فلاح کا ضامن ہونے والا تھا۔

"رسول آخر الزماں، ہادیٔ برحق محمد مصطفیٰ ﷺ کا ظہور ایک ایسے زمانے میں ہوا جب انسان عہد عتیق کا تھکا دینے والا سفر طے کرتے کرتے عہد جدید کے ساحل پر آ پہنچا تھا۔ اور وقت انگڑائی لے کر بیدار ہو رہا تھا۔ بین الاقوامی دور کا آغاز ہونے والا تھا۔ ذہن انسانی دنیا کی تسخیر کے لیے پر تول رہا تھا۔ تہذیب انسانی کا کارواں نقطۂ اتصال پر پہنچ گیا تھا۔ جہاں دو زمانوں کی سرحدیں اب جدا ہو رہی تھیں۔ مختصر یہ کہ آپ ﷺ کی نبوت عہد جدید کے آغاز اور عہد قدیم کے اختتام کا اعلان تھا۔ ظہور قدسی نے نئے دور کا پیغام دیا تھا۔ آپ ﷺ کے پیغام کی ابدیت اور ہمہ گیریت کے پیش نظر اقْرَا بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِی خَلَقَ o لفظ "پڑھنے" سے کیا گیا، کیونکہ عہد جدید میں تعلیم و تربیت کو جو اہمیت حاصل ہونے والی تھی اس کے پیش نظر ضروری تھا کہ ختم المرسلین رسالت مآب ﷺ کی وحی اور رسالت کا آغاز اقراء سے کیا جائے اس پیغام خداوندی میں غالباً یہ راز بھی پوشیدہ تھا کہ اسلام کی کامیابی۔ فتح مندی، اور فروغ کا انحصار لکھنے پڑھنے۔ تعلیم و تدریس۔ تحقیق و جستجو۔ انکشافات اور اکتشافات میں مضمر ہے۔" (1)

(1) الجامعہ ماہنامہ۔ جون 1973ء ص 43۔

انسانیت کی تاریخ میں اسلام نے پہلی مرتبہ علم کی فضیلت و فوقیت اور اس کی عمومیت کی ایسی داغ بیل ڈالی کہ علم اور تحصیل علم پر نہ صرف پادریوں۔ برہمنوں اور شہزادوں کی اجارہ داری ختم ہوئی۔ بلکہ ہر چھوٹے بڑے۔ امیر و غریب۔ عام و خاص۔ آزاد، اور غلام۔ عورت یا مرد کی ضرورت اور بنیادی حق بن کر سامنے آیا۔

''رسول اللہ ﷺ سے پہلے علم پر عام مذہبی پیشواؤں کی اجارہ داری تھی۔ جیسے ہندوستان میں پنڈتوں کی اور یورپ میں پادریوں کی یا صرف بعض امراء پڑھنا لکھنا سیکھتے تھے۔ رسول اللہ نے علم کو ہر انسان کے لیے عام کرنے کی ہدایت فرمائی۔ اور اس اہم کام کو خود بھی کر کے دکھایا۔'' (1)

اس سے قبل تاریخ انسانی کوئی ایسی مثال نہیں پیش کر سکتی، جس سے علم اور حصول علم کو ایسا مقام عطا ہوا ہو۔

انقلاب کی توضیح کرتے ہوئے ڈاکٹر نصیر احمد ناصر لکھتے ہیں۔

''انقلاب کے معنی ہیں۔ معاشرے کے اندر کسی بڑی تبدیلی کا آنا یا لانا۔ اس کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ مذہبی اور دینی ہر انقلاب مذہبی ہوتا ہے یا دینی۔ اس کی دلیل یہ ہے۔ کہ ہر انقلاب تحریک کا مرہون منت ہوتا ہے۔ جس کا اپنا نعرہ ہوتا ہے۔ اور نعرہ اس کی آئیڈیالوجی کا مظہر اور آئیڈیالوجی

(1) فکر و نظر مارچ 1976ء (سیرت نمبر) ص 108۔

تحریک کی توانائی کا مظہر ہوتی ہے۔ یہ تو سامنے کی بات ہے کہ نازیت، فاشیت اور اشتراکیت سب تحریکیں تھیں۔ اشترا کی اپنی تحریک کو غیر مذہبی یا مادی کہتے ہیں۔لیکن وہ اس حقیقت کوتسلیم کریں یا نہ کریں ان کی تحریک مذہبی ہے۔ مذہبی انقلاب کا محرک حقیقی کسی ایک جبلی تقاضے کی تشفی ہوتا ہے۔ مثلاً نازیت اور فاشیت کا محرک حصول قوت کا جبلی تقاضا تھا۔ جبکہ روس اور چین کے انقلاب کا محرک ''تن پروری'' کا جبلی تقاضا تھا۔ اس کے برعکس دینی انقلاب اپنی نوعیت میں کلی ہوتا ہے کیونکہ یہ انسان کے تن اور من کے یا جبلی ومعنوی تقاضوں کی تشفی کے لیے لایا جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق لایا جاتا ہے۔ اس کی بہترین مثال اسلام کا انقلاب ہے۔''

زندگی کا خاصہ حرکت ونمو ہے۔ اس لیے وہ تغیرّ مدام کو چاہتی ہے اسے زندگی کے طبعی انقلاب سے تعبیر کر سکتے ہیں لیکن جب زندگی پر حرکت ونمو کی راہیں مسدود کر دی جاتی ہیں یا اس کی آماجگاہ محدود ہو کر رہ جاتی ہے تو وہ ایک......بڑے تغیر وتبدل یا انقلاب کا تقاضا کرتی ہے۔ جسے جبری یا تاریخی انقلاب کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جس طرح عالم طبیعی میں داخلی و خارجی عوامل کی وجہ سے مرئی یا غیر مرئی تغیرات کا عمل جاری وساری رہتا ہے۔ انسان چونکہ ایک ذی علم وحکمت اور صاحب ارادہ واختیار مخلوق ہے اس لیے وہ ان تغیرات کی نوعیت کو بدلنے کی قدرت رکھتا ہے۔(1)

(1) پیغمبر اعظم وآخر۔ص۔-142-143۔

ہم پچھلے صفحات میں رسول اکرم ﷺ کی بعثت سے پہلے کے عہد کی زبوں حالی، (سیاسی، معاشرتی اور تمدنی حالت) کا بغور مطالعہ کر چکے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جو دنیا کی اس حالت کو بدلنے کے لیے ایک بڑے تغیر اور تبدیل کا تقاضا کر رہا تھا۔ یہ عہد ایک ایسے انقلاب کا منتظر تھا۔ جو انسانیت کو نکبت و افلاس کی اتھاہ گہرائیوں سے نکال کر کسی ایسی راستے پر ڈال دے جہاں سے وہ ایک نئی زندگی اور نئے دور کا آغاز کرے۔ دوسرے الفاظ میں یہ عہد تاریخ انسانی میں نیا موڑ ثابت ہونے والا تھا۔ جہاں سے دور جدید کا آغاز ہو سکے۔

جب کسی انقلاب کی بات ہوتی ہے تو ذہن میں کسی یکا یک تبدیلی کا تصور ابھرتا ہے۔ اسی طرح اسلامی تعلیمی انقلاب کو اگر موجودہ عہد کے حوالے سے دیکھا جائے تو معاً یہ خیال آتا ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ نے فوراً کسی یونیورسٹی کی بنیاد رکھی ہوگی۔ کوئی تعلیمی کمیشن قائم کر دیا ہوگا۔ اور ایک علیحدہ تعلیمی انتظامیہ وجود میں آ گئی ہوگی۔ امتحانات کے لیے بورڈ بنا دیئے گئے ہوں گے۔ ایسا ہرگز نہیں تھا۔ اور نہ اس وقت کا یہ تقاضا تھا۔ بلکہ رسول اللہ ﷺ نے جس تعلیمی انقلاب کی بنیاد رکھی وہ بتدریج ارتقاء پذیر تھا۔ بیس تیئس سال کی قلیل مدت میں ان تمام باتوں کی اساس رکھ دینا کیا کچھ کم تھا۔ جس کے دوررس نتائج دنیا نے اموی اور عباسی عہد میں دیکھ لیے جن میں علم و حکمت۔ تحقیق و تدقیق فکر و فلسفہ اور دیگر علوم کے ایسے سوتے

پھوٹے جن سے ساری دنیا نے رہنمائی حاصل کی۔ اور آج کا ترقی یافتہ دور اسی کا مرہون منت ہے۔ تاہم ہجرت مدینہ اور خصوصاً جنگ بدر کے بعد اس امر کی طرف رسول اللہ ﷺ نے خصوصی توجہ فرمائی جس سے صحابہ رضی اللہ عنہ میں حصول علم کا شوق بڑھ گیا۔ جس کی تفصیل اقتباس ذیل سے واضح ہوتی ہے۔

"مدینہ میں جلوہ افروز ہونے کے بعد تحریک اسلامی ایک نئے موڑ میں داخل ہوئی۔ مکہ میں اسلام مغلوب تھا۔ چند بے سہارا۔ کمزور۔ مفلوک الحال اور منتشر افراد کا گروہ جو کفار کے مظالم سے خوف زدہ۔ پریشان اور غریب الدیار تھا۔ مدینہ پہنچ کر رسول ﷺ خدا نے اقتدار اپنے ہاتھ میں لے کر اسلامی حکومت کی داغ بیل ڈالی۔ مسلمانوں کو ایک وحدت اور ایک مرکز کے تابع کر کے منظم اور متحد کر دیا۔ دنیا کا عظیم ترین انسان اور مدبر اس راز سے یقیناً بے خبر نہ تھا کہ کوئی بھی انقلاب تعلیمی اور ذہنی تغیر بپا کیے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتا۔ کوئی قوم علمی میدان میں فتح مندیاں حاصل کیے بغیر پائیداری اور استحکام حاصل نہیں کر سکتی۔ اور کوئی بھی حکومت ایک فعال اور جاندار نظام تعلیم استوار کیے بغیر عظمت و رفعت کی منزل کو نہیں پہنچ سکتی۔ اس واسطے رسالت مآب ﷺ نے تعلیمی انقلاب بپا کرنے کا

منصوبہ غالباً بہت پہلے بنالیا تھا۔ مدینہ میں داخل ہونے کے بعد فوراً اس پر عمل شروع کر دیا گیا۔"(1)

اس انقلاب نے اسلامی معاشرہ کی تشکیل اور انسانی تمدن کی تعمیر میں کیا کردار ادا کیا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے۔ جس کا جواب اسلامی تعلیمات اور اسوۂ حسنہ کی روشنی میں تلاش کرنا بہت ضروری ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ دیکھنا دکھانا کہ اسلام نے انسانی تمدن میں وہ کون سی خوبیاں اجاگر کر دی تھیں جن کی بنا اسلامی تحریک دوسرے تمام مذاہب عالم کے مقابلے میں انسانی فوز وفلاح کی ضامن بن گئی۔

چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں مدینہ منورہ ایک تعلیمی مرکز بن گیا۔ جس کے نتیجہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک ایسی کھیپ تیار ہوئی جس نے اس تعلیمی پروگرام کو آگے بڑھایا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد ایسی پیدا ہوگئی جس نے آنحضرت ﷺ کے اقوال و افعال اور واقعات سے نہ صرف خود بہرہ ور ہوئی بلکہ دوسروں کو بھی مستفید کیا۔

"صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعداد حیات نبوی ﷺ کے آخیر سال حجۃ الوداع میں تقریباً ایک لاکھ تھی۔ ان میں گیارہ ہزار آدمی ایسے ہیں جن کے نام ونشان آج تک تحریری صورت میں تاریخ کے اوراق میں موجود ہیں۔ جو خاص انہیں کے حالات میں لکھے گئے

(1) اسلامی تعلیم۔ ستمبر۔ اکتوبر 1972ء۔

ہیں۔ یہ اس لیے لکھے گئے ہیں کہ یہ وہ لوگ ہیں جن میں سے ہر ایک نے کم و بیش آنحضرت ﷺ کے اقوال و افعال اور واقعات میں سے کچھ نہ کچھ حصہ دوسروں تک پہنچایا ہے۔ یعنی جنہوں نے روایت کی خدمت انجام دی ہے۔ اور یہی سبب ان کی تاریخی زندگی کا ہے۔"(1)

حضور اکرم ﷺ کی سیرت مقدسہ پر مسلم اور غیر مسلم سیر نگاروں نے تقریباً آپ ﷺ کی زندگی کی ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ لیکن یہ امر غور طلب ہے کہ بطور ماہر تعلیم اور مفکر تعلیم آپ کو جو مقام حاصل ہے۔ اس کو اجاگر نہیں کیا گیا۔ مغربی دنیا نے تعصب کی بناء پر آپ ﷺ کو ماہر تعلیم نہیں سمجھا۔ اور تعلیم و تعلم کے حوالے سے ترتیب و تحریر میں نہیں لائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے شروع ہی سے اس بات کو نا قابل یقین سمجھا تھا۔ کہ ایک اُمّی انسان کا بطور تعلیمی راہنما اعتراف کیا جائے۔ قرآن ہی ان کا صرف معجزہ تھا۔ کہ جو ایک اُمّی انسان پر عربی زبان کی پہلی کتاب کی صورت میں نازل ہوا اور ناخواندہ ماہر تعلیم ہی اس معجزہ کا حامل ہو سکتا تھا۔ ایک مغربی مفکر کی نظر میں صرف بہت ہی تنگ نظر تعلیم کا نظریہ آپ ﷺ کو دنیا کے عظیم ماہرین تعلیم میں جگہ پانے کے جواز کا انکار کرے گا۔ ترقی پسند نقطۂ نظر سے وہ جس نے انسان کا وقار بلند کیا ہے۔ وہ ماہرین تعلیم

(1) خطبات مدراس ص 43۔

کے سرخیل ہیں۔ تاہم کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہوں نے حقیقت حال کا اعتراف کیا ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی اس تعلیمی تحریک کے جو دوررس نتائج بعد کی صدیوں میں ظاہر ہوئے جن میں مسلمانوں کا علمی ذوق وارفتگی کی صورت اختیار کر گیا تھا جس کا حسب ذیل اقتباس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

''رسول اللہ ﷺ کی ہدایات و تعلیمات کی بدولت مسلمانوں میں ایک وسیع عملی تحریک پیدا ہوگئی جس کا تفصیل سے ذکر مسلم مؤرخین نے کیا ہے۔ اور غیر مسلم محققین اس کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکے۔ انگلستان کے ایک مؤرخ، رابرٹ بریفالٹ، لکھتے ہیں کہ اس امر کی نہ کوئی مثال پہلے موجود تھی۔ اور نہ اب تک ہے کہ کسی وسیع سلطنت کے طول بلد اور عرض بلد میں حکمران طبقے اتنے بڑے پیمانے پر حصول علم کی مجنونانہ خواہش سے سرشار ہو گئے ہوں۔ خلفاء۔ امراء اپنے محلوں سے اٹھ کر کتب خانوں اور رصد گاہوں میں جا گھسے ہوں۔ اہل علم کے خطبات کو سنتے اور ان سے مسائل ریاضی کے متعلق مذاکرات کرنے میں۔ ہرگز کوتاہی نہیں کرتے۔ مسودات اور مخطوطات اور نباتاتی نمونوں سے لدے ہوئے کارواں بخارا سے دجلہ تک رواں دواں رہتے۔ کتابوں اور معلموں کے حصول کی خاطر قسطنطنیہ اور ہندوستان کو خاص سفیر بھیجے جاتے تھے کسی سلطنت

سے تاوان جنگ وصول کرنے کے سلسلے میں یونانی مصنفین یا کسی ممتاز ریاضی دان کی تصنیف حاصل کرنے کا مطالبہ کیا جاتا تھا۔ ہر مسجد کے ساتھ ایک مدرسہ ملحق ہوتا تھا۔ وزرائے سلطنت کتب خانوں کے قیام مدارس کے لیے اوقاف کے انتظام اور غریب طلبا کے لیے وظائف کے اہتمام میں رہتے وہ اس کام میں اپنے آقاؤں سے بھی بڑھ جانا چاہتے تھے۔ اہل علم کو بلا امتیاز نسل و مذہب دوسرے سب لوگوں پر فوقیت دی جاتی تھی۔ وہ صوبوں کے گورنر تک مقرر کر دیئے جاتے تھے۔ جب خلفاء کسی سفر یا مہم پر روانہ ہوتے تو اہل علم کا ایک گروہ اور کتابوں سے لدے ہوئے اونٹوں کی ایک قطار ہمراہ ہوتی تھی۔"(1)

یہ اس انقلاب کا اثر تھا۔ کہ مسلمانوں نے نہ صرف مروجہ علوم کی تحصیل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بلکہ کئی نئے علوم دریافت کئے۔ قرون اوّل میں عباسی اور اندلس کے اموی عہد کے مسلمان حکماء، فلاسفہ اور فقہاء نے علوم کے مختلف شعبوں میں گراں قدر اضافے کئے۔ جس سے دوسری اقوام عالم اور خصوصاً اہل یورپ نے بہت فائدہ اٹھایا۔ مسلمانوں کی ان علمی خدمات کا اثر پندرھویں اور سولہویں صدی عیسوی (احیاء العلوم کا عہد) تک محسوس کیا جا سکتا ہے۔

(1) فکر و نظر سیرت نمبر مارچ 1976ء ص 108-109۔

علم کی فضیلت و اہمیت

علم کے لغوی معنی جاننے کے ہیں۔ مگر ہر فن کے جاننے کی نوعیت اور معلومات کی حیثیت مختلف ہوتی ہے۔ وقت کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ ہر فن کی اہمیت بڑھتی اور گھٹتی رہتی ہے۔ موجودہ دور میں سائنس نے انسانیت کی بڑی خدمت کی ہے۔ اس لئے سائنسی علوم کی اہمیت مسلم ہے۔ لیکن انبیاء علیہم السلام کے تعلق سے جب اس (علم) کا استعمال ہوگا تو اس سے طبعاً، خدا کی توحید۔ اس کی ذات وصفات دین وشریعت کے احکام اور اخلاقی تعلیمات مراد ہوگی۔ اس طرح تعلیم جو حصول علم کا وسیلہ وذریعہ ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے اس کی تعریف یوں متعین کی گئی ہے۔ کہ قرآن و حدیث میں کہیں تو تعلیم سے مراد اسلام اور قبول اسلام۔ کہیں اس کا مطلب علم القرآن اور حقیقت امری ہے۔ بعض جگہ حکومت، اقتدار اور علوم الدنیا مراد ہے مثلاً وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا۔ ترجمہ: بے شک ہم نے داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کو علم دیا۔ (نمل۔15)

مروجہ علوم جن کی حضور اکرم ﷺ نے اپنے عہد مبارک میں ضرورت محسوس کی اور مسلمانوں کو ان کے سیکھنے کی ترغیب دی، تعلیم کے زمرے میں

شامل ہیں۔ لہٰذا اسلامی نظام تعلیم سے مراد تعلیم کے حصول کا طریقہ کار یعنی وہ پورا تعلیمی ڈھانچہ جو عہد نبوی ﷺ میں ایک منفرد نظام تعلیم کی صورت میں تشکیل پذیر ہوا۔ عہد نبوی ﷺ میں جس نظام تعلیم کی تشکیل ہوئی۔ اس کا مبداء و معاد قرآن مجید اور آپ ﷺ کا اسوہ حسنہ ہے۔ جو اس تعلیمی انقلاب کی اولین اساس میں سے ہے۔ اور آج بھی اس نظام تعلیم کا محور یہی ہے۔ قرآن حکیم جو الہامی اور تحریف سے مبرا، سماوی کتاب ہے۔ اور مسلمانوں کے نظام تعلیم میں ایک نصاب کی صورت میں شامل ہے۔ انسانی زندگی کے ہر پہلو کی راہنمائی اس سے حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا قرآنِ حکیم و تعلیم کے بارے میں بھی واضح راہنمائی کرتا ہے۔ قرآنی شواہد کے طور پر ان آیات مبارکہ کا ذکر کرنا بے عمل نہ ہوگا۔ جن کا تعلق علم، فضیلت علم اور ترغیب حصول علم سے ہے۔

(1) سارے علم کا سرچشمہ ذات باری تعالیٰ ہے کائنات کا علم جو اس کے علم کا قلیل حصہ ہے۔ لیکن خداوند تعالیٰ نے انسان کو کائنات کا علم دیا ہے۔ جس سے وہ ناواقف تھا تاکہ وہ اپنی دنیاوی زندگی میں اپنے لیے خیر و شر کی تمیز کر سکے۔ علم کا ایک پہلو لکھنا بھی ہے۔ کہ لکھنے کے بغیر علم کا حاصل کرنا ناممکن ہے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔ اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ (علق۔3-4) (اور اس نے انسان کو قلم کے ساتھ علم دیا (لکھنا سکھایا)

اوران چیزوں کا علم دیا جن سے وہ ناواقف تھا)

(2) دوسری مخلوق پر انسان کو جو فضیلت ہے وہ اس شعور اور عقل کی وجہ سے، اور اس علم کی وجہ سے ہے جو خداوند کریم نے اس کو عطا کیا ہے۔ اپنے اس عظیم احسان کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا O (بقرہ۔31)

ترجمہ: اور خدا نے آدم علیہ السلام کو تمام اشیاء کا علم دیا۔

(3) ترغیب حصول علم کا یہ انداز ملاحظہ ہو۔

فَسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ O (نحل۔43)

ترجمہ: تم علم والوں سے پوچھو اگر تم علم نہیں رکھتے۔

(4) جہالت ظلمت اور علم روشنی ہے۔ جو کسی حالت میں اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ خالق کائنات کا یہ استفہامیہ انداز اہل علم کی فضیلت کو اجاگر کرنے کے لیے کتنا معنی خیز ہے۔

قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ (زمر۔6)

ترجمہ: (ان سے) کہو کیا علم رکھنے والے اور بے علم دونوں ایک جیسے ہو سکتے ہیں؟

(5) تقویٰ اور پرہیزگاری کی اولین شرائط میں خوف خدا اور خشیت الٰہی ہے۔ خدا کے نزدیک متقی انسان کا درجہ بہت بلند ہے۔ لیکن تقویٰ بغیر خشیت الٰہی کے پیدا نہیں ہو سکتا۔ صرف اہل علم ہی خدا سے

ڈرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (فاطر۔28)

ترجمہ: خدا سے وہی لوگ ڈرتے ہیں۔ جن کو علم بخشا گیا ہے۔

(6) خداوند قدوس نے اپنے کلام میں انسانوں کے ذہن میں یقین اور پختگی پیدا کرنے کے لیے کئی مقامات پر قسمیں کھائی ہیں۔ اپنی الُوہیت کے مقام کو شہادت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ صرف اپنی شہادت پر اکتفا نہیں فرمایا۔ بلکہ فرشتوں کی گواہی کے ساتھ اہل علم کی شہادت کا بھی ذکر کیا ہے۔ فرشتوں کے ساتھ اہل علم کی شہادت کا ذکر گویا علم اور اہل علم کی فضیلت کا بین ثبوت ہے۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ (آل عمران۔18)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ شہادت دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ فرشتے بھی اس پر گواہ ہیں۔ اور اہل علم کا بھی یہی کہنا ہے۔

اسی طرح دوسری جگہ اہل علم کی شہادت کو اور مستند فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ۔ (رعد۔ 43)

ترجمہ: کہہ دیجئے میرے اور تمہارے درمیان اللہ تعالیٰ بہترین گواہ ہے۔ اور وہ جس کے پاس کتاب کا علم ہے۔

(7) قرآن حکیم اور صاحب قرآن رسول اللہ ﷺ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ (اعراف۔52)

ترجمہ: اور ہم نے ان کو کتاب دی ہے۔ اور علم کی بنا پر اس کو کھول کھول کر بیان کیا ہے۔

اہل علم جو قرآن کے اصل مخاطب ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے لیے اپنے کلام کی فصاحت کا یوں ذکر فرماتا ہے:

كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (اعراف۔32)

ترجمہ: ہم یوں ہی کھول کھول کر بیان کرتے ہیں علم والوں کے لیے۔

(8) رفعت درجات کے لیے ایمان لانے کی شرط کے بعد دوسرا درجہ علم کا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ (مجادلہ۔11)

ترجمہ: تم میں سے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور جو علم سے بہرہ مند ہوئے۔ اللہ تعالیٰ رتبے بلند کرتا ہے۔

اسی طرح قرآن حکیم میں علم کے ساتھ حکمت کا ذکر بھی آتا ہے۔ حکمت کا لفظ اپنی معنوی خصوصیت کے ساتھ خاص معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ علماء اور مفکرین اسلام نے حکمت کو ایک خاص نعمت قرار دیا ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کو عطا فرماتا ہے۔ جو علم سے بالاتر درجہ ہے۔ اور یہ ایک ایسی نعمت ہے جو علم اور عقل کے امتزاج سے حاصل

ہوتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ (بنی اسرائیل۔39)

ترجمہ: یہ ہیں حکمت کی وہ باتیں جو خدا نے تم پر وحی کی ہیں۔

ذیل کے اقتباس میں سید سلیمان ندوی نے حکمت کے بارے میں سیر حاصل بحث کی ہے۔

"قرآن حکیم میں حکمت کے بار بار کے ذکر کی تفصیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکمت کے مظاہر اور نتائج کس قسم کی باتیں ہوتی ہیں؟ یہ عموماً وہی باتیں ہوتی ہیں جن کی عالمگیر صداقت اور سچائی کو خود فطرت انسانی اور حسن اخلاق تسلیم کرتی ہے، چنانچہ قرآن حکیم میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ایک صفت یہ بیان ہوئی ہے۔

يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (جمعہ2)

ترجمہ: وہ مسلمانوں کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

محمد رسول اللہ ﷺ کتاب کے بعد کس حکمت کی تعلیم دیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ خود اپنی حکمت کی۔ تو جس حکمت کی وہ تعلیم دیتے تھے۔ وہ خود ان کے اندر بھی تھی۔ کہ جو چیز ان کے پاس نہ تھی دوسروں کو کیا بخش سکتے تھے؟ اور جب یہ قوت آپ ﷺ کے پاس تھی تو اس کے آثار و نتائج بھی اقوال افعال کی صورت میں نمایاں ہوں گے جن کی آپ ﷺ تعلیم فرماتے تھے۔ اور اپنے ان امور حکمت کی تعلیم سے یہی مقصود ہو سکتا

تھا۔ کہ مسلمان ان پر عمل کریں۔" (1)

گویا حکمت ایک ایسی علمی بصیرت کا نام ہے جس سے خداوند تعالیٰ نے اپنے انبیاء کو نوازا۔ اور خصوصاً محمد رسول اللہ ﷺ کو معلم حکمت بھی قرار دیا۔ غالبًا یہی وجہ ہے۔ کہ حضور اکرم ﷺ سے منقول ہے کہ

اَلْكَلِمَةُ الْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنُ فحيَثُ وَجَدَهَا فَهُوَ اَحَقُّ بِهَا (2) (ترمذی، ابن ماجہ)

ترجمہ: حکمت اور دانائی کی بات ایماندار شخص کی گمشدہ چیز ہے پس جہاں اسے وہ پائے اس کا وہی زیادہ حقدار ہے)

علم کی فضیلت اور اہمیت سے متعلق قرآنی نقطہ نظر کے بعد ان احادیث اور اقوال کی نشاندہی کرنا بھی مناسب ہوگا۔ جس میں حضور اکرم ﷺ نے تعلیم و تعلم کی فضیلت کو اجاگر فرمایا۔

(1) اسلام میں ہر اس علم جس کی تشریح اس باب کے شروع میں کی گئی ہے۔ یعنی ہر وہ علم جو خدا اور اس کے رسول ﷺ کے منشاء کے مطابق اور انسانی فوز و فلاح کا ضامن ہو اس کے حاصل کرنے کو فرض کی حد تک تاکید فرمائی گئی ہے۔

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَمُسْلِمَةٍ (ابن ماجہ)

ترجمہ: علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔

---

(1) سیرۃ النبی ﷺ جلد چہارم ص 106

(2) انتخاب صحاح ستہ ص 158

(2) تَعَلَّمُوا الْعِلْمَ وَعَلِّمُوْهُ النَّاسَ (بیہقی)(1)

(3) علم کے حصول کی راہ اور جنت کی راہ گویا ایک ہی قسم کے راستے ہیں۔ اور یہ ایک دوسرے سے کس قدر مترادف ہیں۔ کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

مَنْ سَلَكَ طَرِيقًا يَلْتَمِسُ فِيهِ عِلْمًا سَهَّلَ اللّٰهُ لَهٗ بِهٖ طَرِيقًا اِلَى الْجَنَّةِ (مسلم)(2)

ترجمہ: جو شخص ایسی راہ اختیار کرے جس میں اسے علم حاصل ہو۔ تو اس کی بدولت اللہ اس کے لیے جنت کی راہ آسان کر دے گا۔

(4) اسلام میں جہاد ان شعائر میں سے ہے جس میں پیش آمدہ تکالیف اور دشواریوں کے پیش نظر بہت ہی بڑے اجر کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ علم کا حصول بھی جدوجہد کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لیے اس کو جہاد کے ہم پلہ قرار دے کر اس کی فضیلت کو آشکارا کرنے کے لیے اس سے بہتر تشبیہ اور کون سی ہو سکتی ہے؟

مَنْ خَرَجَ فِي طَلَبِ الْعِلْمِ فَهُوَ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَرْجِعَ۔ (ترمذی)(3)

ترجمہ: جو علم حاصل کرنے کے لیے گھر سے نکلے۔ وہ اللہ کی راہ (جہاد) میں ہے۔ جب تک واپس نہ آئے۔

(5) طالب علم کی قدردان صرف ارضی مخلوق نہیں۔ بلکہ اس کی قدر کا اندازہ

(1) ایضاً ص 82۔ علم سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ۔
(2) ایضاً ص 83
(3) ایضاً ص 83۔

اس قول سے ہوتا ہے کہ۔

اِنَّ الْمَلٰئِکَةِ لَتَضَعُ اُجْنِحَتَهَا رِضًا لِطَالِبِ الْعِلْمِ(1)(ابوداؤد)

ترجمہ: طالب علم کی خوشی کے لیے فرشتے اس کے روبرو اپنے پر بچھاتے ہیں۔

(6) اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شمار نہیں۔ لیکن علم کی دولت اور دین کی سمجھ کا عطا ہونا، رضائے الٰہی کی خاص نشانیوں میں سے ہے۔ جس کی تصدیق اس قول سے ہوتی ہے۔

مَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَیْرًا یُّفَقِّهْهُ فِی الدِّیْنَ(2)(الشیخان۔ترمذی)

ترجمہ: جس شخص کے واسطے اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ اسے دین کی سمجھ عطا کرتا ہے۔

(7) علم خیر ایک لازوال دولت ہے۔ جسکی حدود کا سلسلہ موت تک قائم رہتا ہے۔ اور اگر اسی حالت میں موت واقع ہو جائے تو جنت تک پہنچنے کی منزل میں کوئی رکاوٹ موجود نہیں۔ حدیث نبوی ﷺ میں اس کی تصدیق یوں ہوتی ہے۔

لَنْ یَّشْبَعَ الْمُؤْمِنُ خَیْرٍ یَّسْمَعُهٗ حَتّٰی یَکُوْنَ مُنْتَهَاهُ الْجَنَّةَ(3)(ترمذی)

ترجمہ: (ایماندار آدمی نیک باتیں سیکھنے سے سیر نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ اس کا انجام (فوت ہونے کے بعد) جنت میں ہوتا ہے۔

(8) والدین کا اپنے بچوں کے لیے بہترین عطیے کا حسن انتخاب ملاحظہ ہو۔

---

(1) بحوالہ فن تعلیم وتربیت ص 83۔

(2) بحوالہ انتخاب صحاح ستہ ص 157۔

(3) ایضاً ص 157 وفیوض الباری شرح صحیح بخاری ص 249۔

مَانَحَلَ وَالِدٌ وَلَدًامِّنْ نَحْلٍ اَفْضَلَ مِنْ اَدَابٍ حَسَنٍ(1)(ترمذی)

ترجمہ: باپ کا کوئی عطیہ بیٹے کے لیے اس سے بڑھ کر نہیں۔ کہ اس کی تعلیم و تربیت اچھی کرے۔

حضور اکرم ﷺ نے جس تعلیمی نظام کی بنیاد رکھی تھی۔ اس کے مضمرات کے پیش نظر آپ ﷺ کو معلوم تھا۔ کہ ایک وقت ایسا آئے گا۔ کہ شہوار علم کی باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوگی اس لیے آپ ﷺ نے تاکیداً فرمایا۔

اِنَّ رِجَالًا يَاتُوْنَكُمْ مِنْ اَقْطَارِ الْاَرْضِ يَتَفَقَّهُوْنَ فِي الدِّيْنِ فَاِذَا اَتُوْكُمْ فَاسْتَوْصُوْا بِهِمْ (2)(ترمذی)

ترجمہ: اطراف زمین سے لوگ تمہارے پاس علم دین سمجھنے آئیں گے۔تم ان کو بھلائی کی تلقین کرنا۔

علم کی فضیلت اس دلچسپ واقعہ سے بھی آشکارا ہوتی ہے۔ جو حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے۔ کہ

"ایک دن جب رسول کریم ﷺ مسجد نبوی میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہاں دو قسم کے لوگ موجود ہیں۔ کچھ لوگ تو نفل اور خدا کی عبادت میں مشغول تھے اور کچھ لوگ فقہ کی تعلیم و تعلم میں منہمک تھے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا دونوں ہی لوگ اچھا کام کر رہے ہیں۔ البتہ ایک کا کام اچھا ہے۔ جو لوگ خدا سے

(1) بحوالہ انتخاب صحاح ستہ ص 44۔

(2) بحوالہ فن تعلیم و تربیت ص 86۔

مانگ رہے ہیں ان کے متعلق خدا کی مرضی ہے کہ چاہے تو دے چاہے تو نہ دے۔ البتہ دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو علم حاصل کر رہے ہیں۔ اور جہالت کو دور کر رہے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ خود میں بھی معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ یہ کہتے ہوئے آپ ﷺ نے اس حلقے میں جگہ بنائی جہاں درس ہو رہا تھا۔"(1)

الغرض ایسے کئی اقوال و افعال جو علم کی ترغیب اس کی اہمیت اور فضیلت کے بارے حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں (جن کو بخوف طوالت پیش نہیں کیا جا رہا) جن میں علم حاصل کرنے کی تاکید۔ عالم اور متعلم کے فضائل۔ اجر آخرت کی بشارت، زاہدوں اور عابدوں پر فضیلت وغیرہ کی اخبار موجود ہیں۔ جن کی روشنی میں ہم بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ کہ قرآنی آیات اور اقوال رسول ﷺ میں جس انداز سے علم کی فضیلت اور اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ کسی اور مذہب میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ یہی وہ برکات تھیں جن کے پیش نظر چند صدیوں میں (خصوصاً عباسی اور اندلس کے اموی عہد میں) دنیائے علم کی امامت مسلمانوں کے ہاتھ میں آ گئی۔ اور مسلمان علماء مفکرین۔ فقہاء اور فلاسفہ نے اپنے اپنے میدان علم میں ایسے گراں قدر اضافے کئے جن سے ساری دنیا نے فائدہ اٹھایا۔

(1) ترجمان اہل سنت کراچی شمارہ مارچ 1977 ص 33۔

تعلیم کے اصول

حضور اکرم ﷺ کی قیادت میں اسلامی انقلاب جیسے عظیم کام کا برپا ہو جانا جہاں ایک واضح اور غیر معمولی احسان ربانی ہے۔ وہاں حضور اکرم ﷺ کی دانشورانہ، حکیمانہ اور جراءت مندانہ قیادت کا بھی بڑا عمل دخل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت کو پورا کرنے کے لیے عالم اسباب میں سے جن موزوں ترین عوامل کو یکجا کرنے کی ضرورت محسوس فرمائی ان عوامل میں سب سے بڑا اور سب سے موثر عامل حضور اکرم ﷺ کی ذات مبارکہ تھی۔ آپ ﷺ میں وہ ساری خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں جن سے اسلامی انقلاب جیسا منفرد تاریخی کارنامہ انجام دیا جا سکتا تھا۔

انقلاب اسلامی محض ایک کرسی حاصل کرنے کا مسئلہ نہ تھا۔ جو بالعموم ہر طالع آزما اور سیاسی مہم جو کا مسئلہ ہوتا ہے۔ بلکہ یہ طالع آزماؤں کے آگے بند باندھ کر خدا کے نیک بندوں کو آگے لانے کا مسئلہ تھا۔ یہ بڑا پیچیدہ اور شاخ در شاخ الجھا ہوا مسئلہ تھا۔ حضور اکرم ﷺ کی 23 سالہ جدو جہد کا مطالعہ یہ بات بار بار ہمارے سامنے لاتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ملت کے اندر اتحاد کو بڑی اہمیت دی آپ ﷺ نے سب انسانوں کے لیے

ایسی نظریاتی اور اصولی بنیادیں فراہم کیں جو پہلے سے سعید فطرت انسانوں کے درمیان متفقہ علیہ چلی آ رہی تھیں۔ جس میں سب سے اہم کام اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار کرنا۔ اور آخرت میں اپنے اعمال کی جواب دہی کا احساس تھا۔ توحید سے انسانوں کے درمیان مساوات اور آخرت کے عقیدے سے ذمہ داری پیدا ہوتی ہے۔ بلا شبہ بعض لوگوں نے باپ دادا کے عقیدہ کے بگاڑ کی حفاظت کے لیے کچھ مزاحمت بھی کی جو ناگزیر تھی۔ اور خود حضور ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کی انقلابی تربیت کے لیے بھی اس مزاحمت کی ضرورت تھی۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ یہ بنیادیں کثیر انسانوں کے اندر مدت دراز سے متفق علیہ چلی آ رہی تھیں اور یہ ایسی انوکھی باتیں نہ تھیں جنہیں تسلیم کر لینے سے کوئی شخص بہت ہی دور از خیال انوکھے اصولوں کو تسلیم کرنے کا مرتکب ہو جاتا۔ ان باتوں کو فطرتاً اور اصولاً سب جانتے تھے۔ صرف اپنے باپ دادا کے پیدا کردہ سفارشیوں کو اپنے لیے آسان اور مفید قرار دیتے تھے۔ چنانچہ ان لوگوں نے ان اصولوں کو تھوڑی سی مزاحمت کے بعد تسلیم کر ہی لیا تھا۔ جس سے اتحادِ ملت پیدا ہو۔ دوسرا مسئلہ امن و امان کا تھا جو اسلامی انقلاب کی ترویج اور تبلیغ کے لیے نہایت ضروری تھا۔ چنانچہ حضور ﷺ نے دعوت اسلامی کے لیے بطور ضرورت اور حکمت کے ان کے حالات کو ہمیشہ بہت اہمیت دی اور ایسے حالات پیدا کرنے کی بہت کوشش کی جن سے دعوت کے اخلاق و

کردار اپنا کام کرسکیں۔ اور تعصّبات حائل نہ ہوں۔ یہ دونوں چیزیں حضور ﷺ کی جدو جہد میں ہمیں بطور اصول کے پورے عرصۂ جدو جہد میں رواں دواں نظر آتی ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے اپنے انقلاب کے لیے عرب کردار کو زیادہ توڑنے پھوڑنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ کیونکہ عربوں میں بنیادی انسانی کردار کی بہت سی خوبیاں پہلے سے موجود تھیں۔ ان میں بنیادی طور پر حمیت تھی۔ شجاعت اور غیرت تھی۔ فیاضی اور مہمان نوازی تھی۔ جذبہ مہم جوئی اور شوق سیاحت تھا۔ امانت داری اور دیانت کا تصور موجود تھا۔ پاس عہد کا احساس مروت، دوستی اور وفا داری تھی۔ حضور اکرم ﷺ نے قدیم عرب کی ان خوبیوں کو قائم رکھا اور ان سے فائدہ اٹھایا۔ آپ ﷺ نے ان غریبوں میں مناسب صالحیت کا اضافہ کر کے انسانیت کے لیے انہیں زیادہ مثبت اور مفید بنایا۔ لیکن ان کے قومی کردار کی زیادہ توڑ پھوڑ نہیں کی۔ مثلاً بنائے کعبہ کے بارے میں حضور ﷺ نے ایک بار ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا۔ کہ حطیم کا حصہ کعبے کی عمارت کا حصہ ہے میں اسے ڈھا کر عمارت میں شامل کر دیتا۔ لیکن اے عائشہ رضی اللہ عنہا تیری قوم ابھی جدید الاسلام ہے اس لیے مناسب نہیں ہے۔

الغرض حضور اکرم ﷺ نے تحریک اسلامی کی اشاعت وتبلیغ کے لیے اپنے حکیمانہ تدبر کے جو اصول اپنائے وہ فطرتی، انسانی، اور قومی نفسیات

کے عین مطابق تھے۔ جس میں ہدایت خداوندی کی رہنمائی برابر شامل حال تھی۔ اگر کہیں ان اصولوں سے صرف نظر ہو جاتی تو خداوند کریم خود رہنمائی فرما دیتے۔ سورہ مائدہ کی آیت نمبر 13 جس کا ترجمہ یہ ہے۔

"اے محمد ﷺ۔ جس نے بے نیازی برتی تم اس کے پیچھے پڑتے ہو۔ حالانکہ اگر وہ نہ سدھرے تو تم پر اس کی کیا ذمہ داری ہے؟ اور جو تمہارے پاس دوڑا آتا ہے۔ اس حال میں کہ وہ اللہ سے ڈر رہا ہے تو تم اس سے بے رخی برتتے ہو۔ ہرگز نہیں یہ تو ایک نصیحت ہے جس کا جی چاہئے اسے قبول کرے" (مائدہ۔5-13)

قرآن اور سیرۃ رسول مقبول ﷺ کا ہر طالب علم اس آیت کے شان نزول سے ہرگز بے خبر نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ معاشرتی مرتبے کی بجائے قبول حق کو معیار فضیلت قرار دینا اللہ تعالیٰ کے نزدیک اشاعت دین کے لیے ایک فطرتی اصول ہے۔ جس کی طرف رسول اللہ ﷺ کی توجہ مبذول کرائی گئی۔ چنانچہ حضور اکرم ﷺ نے تبلیغ دین کے لیے جن فطری اصولوں کو پیش نظر رکھا۔ سیرۃ طیبہ کے مطالعہ سے ان کو مندرجہ ذیل سطور میں اخذ کرنے کی کوشش کی گئی۔

ارشاد خداوندی ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلاً مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ

وَالْحِكْمَةَ (آل عمران۔164)

ترجمہ: بیشک اللہ نے مومنوں پر احسان کیا۔ جبکہ ان میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجا۔ جو ان کو اس کی آئتیں سنا ۔ ہے۔ اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

مذکورہ بالا آیات میں خداوند کریم نے مومنوں پر جس امر کا احسان جتایا ہے اس کی روشنی میں بعثت نبوی ﷺ کے مقاصد کی توضیح ہوتی ہے۔ اور ایک نبی کی ذمہ داری اور اس کی تفویض کا اشارہ بھی ملتا ہے۔ کہ دنیا میں ایک نبی آ کر کیا کیا کام سرانجام دیتا ہے۔ اس آیت مبارکہ کی روشنی میں ان مقاصد کی تعین یوں کی جاسکتی ہے۔

(1) اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھنا اور انکو سکھانا۔

(2) ان آیات کی توضیح وتشریح کرنا۔

(3) شرک اور بدعتوں سے تزکیہ کرنا۔

(4) کتاب اور حکمت کی تعلیم بہم پہنچانا۔

ان مقاصد کی روشنی میں آپ کی تعلیم کے ان اصولوں کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ جن کو آپ ﷺ نے اپنی قولی اور عملی زندگی میں اپنایا۔ اور رسالت اور نبوت کا پیغام ہر خاص و عام کو پہنچایا۔ اور ایک معلم اور ماہر تعلیم کی حیثیت سے اس مفوضہ مشن کو بطریق احسن نبھایا۔

(1) تعلیم کی ہمہ گیری:

رسول اللہ ﷺ اور دوسرے انبیاء علیہم السلام میں بنیادی فرق یہ ہے۔ کہ پہلے انبیاء علیہم السلام کے پیغام کی وسعت محدود تھی۔ ان کو کسی ایک قوم ایک گاؤں یا ایک ملک کی اصلاح کا کام تفویض ہوتا تھا۔ لیکن آپ ﷺ کی تعلیم کا مخاطب بنی نوع انسان ہے۔ جس میں زمانی و مکانی بعد ہرگز حائل نہیں۔ لہٰذا آپ ﷺ کی تعلیم ہمہ گیر ہے۔ اور آپ ﷺ کی تعلیم کا مقصد عوام و خواص دونوں کی تعلیم و تربیت کرنا ہے۔ اس لیے ایک ہی طریق اپنایا گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ کچھ زیادہ استعداد کی حامل طبیعتیں اپنی خدا داد صلاحیتوں کے پیش نظر اپنا مقام پیدا کر سکتی ہیں۔ آپ ﷺ کی تعلیم صرف قریش اور اہل حجاز کے لیے نہ تھی۔ بلکہ آپ ﷺ کے مخاطب حضرت بلال رضی اللہ عنہ۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ اور آپ ﷺ کی تعلیم اہل روم اور اہل فارس کے لیے بھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْ کے ساتھ یَآ اَیُّھَا النَّاس کے تخاطب کا انداز بھی موجود ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ کے مختلف بادشاہوں کے نام تبلیغی خطوط اور اسلام کی ترویج و اشاعت کے لیے جو دوسرے انداز اپنائے گئے اس کے ثبوت میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔

(2) ہمہ پہلو تربیت کو سامنے رکھنا:

آپ ﷺ کی تعلیمات کا دوسرا اصول جو سامنے آتا ہے۔ وہ یہ کہ تعلیم

کا مقصد صرف عقائد کی درستی اور چند اعمال کی تربیت نہیں ہے۔ بلکہ انسان کی زندگی کے ہر پہلو کی تربیت مقصود ہے۔ جس پر ہر انسان خواہ وہ امیر ہو یا غریب۔ بڑا ہو یا چھوٹا۔ جوان ہو یا بوڑھا۔ باپ ہو یا بیٹا جہاں ہو جس حیثیت کا حامل ہو۔ اس کے اعمال وعقائد، اخلاق واطوار اس کے فرائض وحقوق غرضیکہ ہر پہلو کی اصلاح وتربیت کرنا مقصود ہے۔ چنانچہ اسلامی تعلیمات میں انسانی زندگی کا کوئی ایسا پہلو اوجھل نہیں۔ جس کے لیے راہنمائی بہم نہ پہنچائی گئی ہو۔

(3) بتدریج تبدیلی کا اصول:

یہ امر واقع ہے کہ ہمیشہ ہدایت خداوندی کا سورج ایسے معاشرہ میں طلوع ہوا۔ جو ظلمت کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب چکا ہو۔ اس میں نسبتاً دوسرے معاشرہ کے بگاڑ زیادہ ہو۔ اور اس میں اخلاقی اور معاشرتی برائیاں گہری جڑیں پکڑ چکی ہوں۔ ایسی صورت میں یکسر تبدیلی مشکل ہوتی ہے۔ عرب معاشرہ بعثت نبوی ﷺ کے وقت ایسی ہی صورت حال سے دو چار تھا۔ اس لیے بتدریج تبدیلی کے اصول کو اپنایا گیا۔ چند بنیادی عقائد کو چھوڑ کر عام معاشرتی برائیوں کی تبدیلی بتدریج عمل میں آئی۔ شراب کی حرمت۔ کھانے پینے۔ لباس ورہائش۔ عادات اور رسومات وغیرہ یکسر نہیں بدلے بلکہ پہلے سارے معاشرہ کو مدنظر رکھتے ہوئے جو بات اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف نظر آئی اس کو بدل دیا۔ اور جو اس کے مطابق ہوئی۔ باقی

رہی۔ اور جو باتیں کچھ خلاف اور کچھ موافق ہوں۔ ان میں ترمیم کی گنجائش رکھی گئی۔ احکام کے بتدریج ارتقاء کے سلسلے میں ایک پہلو یہ بھی محل نظر تھا۔ کہ اسلام کی تعلیم صرف عربوں کے لیے نہیں بلکہ ایک ہمہ گیر انقلاب تھا۔ جس کی تعلیمات کی مخاطب ساری انسانیت تھی۔ سب سے بڑا نکتہ احکام کے تدریجی اصول میں یہ تھا کہ ان سے مقصود عربوں کو صرف بتا دینا نہیں تھا۔ بلکہ عملاً ان کی زندگی میں ان کو کار بند بنا دینا تھا۔ اس لیے نہایت آہستہ آہستہ ترتیب کے ساتھ ان کو آگے بڑھایا گیا۔ اس نکتہ کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نہایت خوبی سے بیان فرمایا ہے۔ کہ پہلے عذاب وثواب کی آیتیں نازل ہوئیں۔ جب دلوں میں استعداد اور رفعت پیدا ہوگئی تو احکام نازل ہوئے۔ ورنہ پہلے ہی دن۔ اگر یہ حکم نازل ہوتا کہ شراب نہ پیو تو کون مانتا۔(1)

(4) سیدھی اور صاف تعلیم:

مبتدی کے عقل وفہم کے مطابق بات کرنا تعلیم کا مسلمہ اصول ہے۔ مراقبہ اور مجاہدہ سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ انبیاء کے خطاب کا موضوع نہیں ہوتا۔ ان کے خطاب کا انداز ایسا ہوتا ہے کہ وہ کم سے کم فہم وادراک رکھنے والے ذہن میں بھی آ سکے۔ البتہ ان کی گفتگو میں ایسے اشارات بھی ملتے ہیں جو بلند عقل وشعور کے حامل لوگوں کے لیے ہوتے ہیں۔ عام طور پر انداز

(1) سیرت النبی ﷺ جلد دوم ص 101۔

نہایت سادہ اور صاف ہوتا ہے۔ آپ ﷺ کی تعلیم کا انداز ان جملہ خوبیوں سی متصف تھا۔ آپ ﷺ لوگوں کو ایسے راستے بتاتے ہیں۔ جن سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے۔ اوران سے منع فرمایا جو خداوند کریم کی ناخوشی کا سبب بنتے ہیں۔ آپ ﷺ نے ان جملہ احکام کا سمجھاتے وقت پر پیچ مصلحتوں سے اعتراز فرمایا۔

(5) عملی نمونہ پیش کرنا:

ارشاد خداوندی ہے کہ ایسی بات مت کہو جس پر تم عمل نہیں کرتے۔ تعلیم وتدریس کے عمل میں بھی زبانی جمع خرچ کے اثرات اتنے دیر پا نہیں ہوتے جتنا عملی طور پر پیش کیے گئے اعمال کا نمونہ گہرے نقوش ثبت کرتا ہے اور خصوصاً اخلاقی اور معاشرتی تعلیم کا بہتر اور مؤثر ذریعہ عمل کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ رسول خدا نے اس اصول کے تحت اپنی زندگی کو نمونہ بنا کر پیش کیا۔ جس کا خداوند کریم نے بدیں الفاظ میں بیان فرمایا:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب۔21)

(بے شک تمہارے لیے رسول ﷺ خدا کے کردار، میں بہترین نمونہ ہے)

اسی طرح خداوند کریم نے رسول خدا کی اتباع کو اپنی اتباع قرار دیا اور ارشاد فرمایا: قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔ آپ ﷺ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو۔

اللہ تم سے محبت کرے گا، اخلاق کی عملی صورت کا نام خلق و اخلاق، ہے قرآن کے الفاظ ہیں اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (بے شک تمہارا اخلاق بہت اعلیٰ ہے) حضور اکرم ﷺ اخلاق کے لحاظ سے نہایت بلند انسان تھے۔ جو کچھ قرآن میں تھا۔ وہ سب کچھ مجسم ہو کر آپ ﷺ کی زندگی میں نظر آیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کیا خوب فرمایا کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰن (ابوداؤد) یعنی آپ ﷺ کے اخلاق (مجسم) قرآن تھے)

گویا اپنی تعلیمات کا مکمل اور اکمل نمونہ خود رسول اللہ ﷺ کی ذات بابرکات تھی۔ جس کے پیش نظر اسلام کی تعلیمات کی نہ صرف ترویج ہوئی بلکہ جس کسی نے بھی آپ ﷺ کو دیکھا اس کے دل میں اسلام واضح ہو گیا۔ عمل اور عقیدہ کی پختگی کا بہترین ذریعہ آپ ﷺ کی ذات تھی۔ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ آپ ﷺ کی سیرت کا سب سے روشن پہلو یہ ہے کہ آپ ﷺ نے بحیثیت پیغمبر کے اپنے پیروؤں کو جو نصیحت فرماتی اس پر سب سے پہلے خود عمل کر کے دکھایا۔" (1)

(1) خطبات مدراس ص 121۔

مقاصد تعلیم

اسلام یا رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کا اصل مخاطب نہ امریکہ کا طالب علم ہے اور نہ فرانس کے کسی ابتدائی مدرسہ کا اسٹوڈنٹ اور نہ کسی ملک یا قوم کے کسی مخصوص تعلیمی ادارے کا طفل مکتب ہے۔ بلکہ آپ ﷺ کی تعلیمات کا مخاطب ہر دور کا انسان ہے۔ جو جہالت کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اخلاقی اور معاشرتی پستیوں کے گہرے کھڈوں میں روشنی کی امید کا طالب ہے۔ لہٰذا بلا تخصیص زماں و مکاں اور جنس و عمر اسلامی تعلیمات کا مقصد یہ ہے کہ ہر دور کا انسان اپنے خالق حقیقی کو پہنچانے۔ اس کی نعمتوں پر شکر گزار ہو۔ اور صالح انسان بن کر ایک مہذب معاشرہ کی تشکیل کرے۔ ارشاد خداوندی ہے کہ

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (سبا۔28)

ترجمہ: اور ہم نے تم کو خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔

اس آیت کریمہ کی روشنی میں اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ اسلامی تعلیمات کا اصل موضوع ساری انسانیت کی اصلاح ہے۔ تاہم قرآن وسنت کی روشنی میں اسلامی تعلیمات کے مقاصد کی مزید وضاحت

کے لیے مندرجہ ذیل مقاصد کا تعین کیا گیا ہے۔

(1) معرفت اور رضائے الٰہی کا حصول:

خالق کائنات جس نے اس ساری کائنات کو پیدا فرمایا۔ انسان کو رنگینی کائنات کا اہم جز بنایا۔ اور تمام ارضی مخلوقات پر اس کو شرف بخشا۔ اشرف المخلوقات کی صفت سے متصف ہونے کا سبب یہ ہے کہ انسان کو عقل و شعور کی دولت وودیعت فرمائی گئی۔ عقل و شعور کی بدولت انسان اپنے بھلے اور برے کی تمیز کر سکتا ہے۔ اس خداداد دولت کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ انسان اپنے خالق حقیقی کو پہنچانے اور اس کا عرفان اور رضا حاصل کرے۔ تاکہ وہ دونوں جہانوں میں حسنات سے بہرہ ور ہو۔ خالق کو چونکہ اپنے مخلوقات سے ماما سے ستر گنا زیادہ محبت ہے۔ اس لیے اس نے ہدایت انسانی کے لیے ایک طریق کار اپنایا اس مقصد کے حصول کے لیے خداوند کریم نے اپنی برگزیدہ بندوں یعنی نبیوں اور رسولوں کے ذریعے ہدایت کے مواقع بہم پہنچائے۔ ان آسمانی ہدایات کے پیش نظر اسلام کی تعلیم کا اولین مقصد معرفت اور رضاء الٰہی کا حصول ہے۔ دوسرے الفاظ میں انسان اور خدا کے درمیان اس تعلق کو استوار کرنا ہے جس کے نتیجے میں انسان بخوشی و خاطر اپنے زندگی کے تمام امور میں خداوندی احکام پر عمل کرتا اور رضاء الٰہی کو اپنی پسند و ناپسند کا معیار ٹھہراتا ہے۔ اور قرآن کے الفاظ میں اس کا ارتقائی اور انتہائی مقام یہ ہو۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (انعام۔163)

ترجمہ: (اے محمد ﷺ) کہہ دیجئے میری نماز۔ میرے تمام مراسم عبودیت۔ میرا جینا اور مرنا سب کچھ رب العالمین کے لیے ہے۔

انسان کو معرفت اور رضاء الٰہی کے اس معیار پر پورا اترنے کے لیے کچھ اور تقاضے پورے کرنے ہوتے ہیں۔ جو اس مقصد اولیٰ کے حصول کا ذریعہ بھی ہیں۔ ان تقاضوں میں انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک کا نائب۔ تابع فرماں بندہ اور صالح انسان بن کر اپنی زندگی بسر کرے۔ اس کا دل خوف خدا سے ہر وقت معمور ہو۔ عبادت الٰہی کو نہایت تابع داری اور صالحیت کا مظہر بنائے اور خدائی نعمتوں پر شکر گزار ہو۔ اس جامع مقصد کے حصول کیلئے حسب ذیل عنوانات کے تحت اس کی تشریح مزید ہو گی۔

(i) نیابت الٰہی:

وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً ۔

(بقرۃ۔30)

ترجمہ: اور جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں گویا انسان اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے۔

سورۃ انعام میں اس آیت کو یوں بیان کیا گیا ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَكُمْ فِیْ مَآ اٰتٰىكُمْ۔(انعام۔166)

ترجمہ: اور وہ اللہ ہی ہے جس نے تم کو زمین میں نائب بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض سے اونچے درجے دیئے تاکہ جو کچھ ہم نے اس کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش ہے۔

نیابت الٰہی کی حیثیت کیا ہے اس ضمن میں مولانا مودودی فرماتے ہیں۔

''کہ انسان کی حیثیت اس دنیا میں خدا کے خلیفہ کی ہے۔ خلیفہ کہتے ہیں نائب کو۔ نائب کا کام یہ ہے کہ جس کا وہ نائب ہے اس کی اطاعت کرے وہ نہ تو اس کے سوا کسی اور کی اطاعت کر سکتا ہے کہ ایسا کرے تو باغی سمجھا جائے گا۔''(1)

مولانا اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''نائب کا اولین فرض یہ ہے کہ جس کا نائب ہو اس کی فرمانبرداری اس کی حکومت اور اس کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو نہ تو وہ نائب ہونے کی حیثیت کو سمجھ سکے گا۔ اور نہ اپنی امین ہونے کا صحیح تصور اس کے ذہن میں پیدا ہوگا۔ نہ اپنے ذمہ دار اور جواب دہ ہونے کا احساس کر سکے گا۔

(1) اسلامی تہذیب اور ان کے اصول ومبادی ص29

اور نہ اس امانت میں جو اس کے سپرد کی گئی ہے اپنی ذمہ داریاں
اور اپنے فرائض صحیح طور پر ادا کرنے کے قابل ہوگا۔" (1)

متذکرہ آیات اور اقتباس کی روشنی میں یہ بات اخذ ہوتی ہے کہ نیابت الٰہی کی حقیقی معنوں میں حیثیت یہ ہے کہ خالق کی اقتداء کرنے اور اس کی مقرر کی گئی حدود کے اندر جو اختیارات انسان کو دیئے گئے ہیں ان سے تجاوز نہ کرے۔ تب ہی وہ خلافت کے منصب کا صحیح مستحق بن سکتا ہے۔ معرفت اور رضائے الٰہی کے حصول کا یہ پہلا زینہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو نیابت الٰہی کا اہل ثابت کرے۔

(ii) عبادت الٰہی:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ O (ذاریات۔56)

ترجمہ: اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لیے پیدا کیا
ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔

اس آیت کی رو سے انسانی تخلیق کا مقصد عبادت الٰہی قرار دیا گیا ہے۔ رضاء الٰہی کے حصول کا ذریعہ خدا کی بندگی ہے۔ اور اس کو اپنا حقیقی معبود سمجھ کر اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے خدا کے سوا کسی کو الٰہ ماننا اور کسی غیر کے سامنے سر نیاز جھکانا شرک ہے۔ عبادت الٰہی سراسر اطاعت خداوندی ہے اس لیے ارشاد ہوتا ہے۔

(1) ایضاً 30-31۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰہِ۔ (النساء۔64)

ترجمہ: اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اس لیے بھیجا ہے کہ بحکم خدا اس کی اطاعت کی جائے۔

قرآن و حدیث میں اس کے عمل کی توضیع و تشریح موجود ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے مرتبہ نیابت کو پہنچانے کے ساتھ ساتھ اپنے خالق کے ساتھ ایسا تعلق ستوار کرے جو ایک بندے اور معبود میں فی الواقع ہونا چاہیے۔ زندگی بے بندگی شرمندگی تو ایک عام مقولہ ہے۔ تاہم بندگی فی نفسہ ایک ایسا مقام ہے۔ جس کی شاعر مشرق نے ان الفاظ میں تصریح فرمائی ہے۔

؎ مقام بندگی دے کر نہ لوں شان خداوندی

عبادت الٰہی سے خدا اور انسان میں جو تعلق پیدا ہوتا ہے وہ ایک کیفیت ہے جس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ اطاعت اور فرمانبرداری کوئی جرمانہ یا سزا نہیں جس کو کرنے یا برداشت کرنے کا یہ حکم دیا گیا ہے بلکہ یہ تو رب کے ماننے کا عملی تقاضا ہے۔ اور یہ تقاضا تب پورا ہوسکتا ہے جب انسان اس کے لیے محبت کا ثبوت دے بلکہ یہ تقاضا انتہائی محبت چاہتا ہے۔ خوش دلی چاہتا ہے۔ اس محبت کے اظہار کا عملی طریقہ یہ بتایا کہ جو اس کے بھیجے ہوئے معلم کی پیروی کرے گا۔ اللہ اس سے محبت کرے گا۔ اس کو ایک مقام پر یوں فرمایا۔(1)

(1) عہد رسالت کا نظام تعلیم ص 33۔

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ۔

(ال عمران۔31)

ترجمہ: اے نبی لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔

(iii) خوف خدا:

رضائے الٰہی کے حصول کا اہم ذریعہ خوف خدا ہے جو اس کی عظمت کبریائی کو تسلیم کرنے کا دوسرا نام ہے۔ خدا سے ڈرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے دل میں ہمیشہ یہ احساس موجود رہے کہ اللہ تعالیٰ قادر مطلق، سمیع و بصیر اور درون دل پوشیدہ بھیدوں کو جاننے والا ہے۔

وَسِعَ کُرْسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ

(اور کائنات کی کوئی چیز اس کے احاطہ قدرت سے باہر نہیں)

وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ

ترجمہ: اور اللہ سے ڈرو بے شک اللہ تمہارے سب اعمال کو جانتا ہے۔

اس احساس کے پیش نظر انسان کو یہ بات بھی مدنظر رکھنی چاہیے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنے رب کی مرضی اور رضاء کے خلاف کوئی تصرف کر بیٹھے اور اس کے اس فعل سے خداوند کریم ناراض ہو جائے۔

خوف خدا کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس سے عمل میں تحریک پیدا ہوتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ خدا سے ڈرنے والا انسان ایسا عمل کرے گا جس

میں خدا کی رضاء مقصود ہو اور ان اعمال سے اجتناب کرے گا جو اس کی ناراضگی کا سبب بنے گا۔

خوف خدا کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جس انسان کے دل میں خدا کا خوف موجزن ہو گا اس کے دل میں اور کسی چیز کا خوف جگہ نہیں پاتا۔ ارشاد فرمایا:

لَا تَتَّخِذُوْا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ○ وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا ؕ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ ○ (نحل۔ 51-52)

ترجمہ: دو دو معبود نہ بناؤ۔ معبود وہی ایک ہے تو مجھ ہی سے ڈرتے رہو۔ اور جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے سب اسی کا ہے۔ اور اس کی عبادت لازم ہے۔ تو (اس لیے) خدا کے سوا اوروں سے کیوں ڈرتے ہو۔

(iv) شکر گزاری:

اسلام میں انسان کے اجتماعی اور انفرادی حقوق و فرائض کا مقصد صرف رضاء الٰہی کا حصول ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اسلام میں جو خطوط متعین کیے گئے ہیں ان پر عمل پیرا ہو کر انسان اپنے معبود کا قرب حاصل کر سکتا ہے۔ تاہم اس قرب میں استواری لازم ہے۔

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ - (بقرہ۔ 152)

ترجمہ: سو تم مجھے یاد کیا کرو۔ میں تمہیں یاد کیا کروں گا۔ اور میرا

احسان مانتے رہنا ناشکری نہ کرنا۔

اس آیت کریمہ کی روشنی میں تعلق کے تسلسل۔ احسانمندی اور ناشکری سے اجتناب کا حکم فرمایا۔ احسان مندی اور شکرگزاری کی صفات کا عمل تو انسان کی اجتماعی زندگی میں ایک دوسرے کے ساتھ بھی شامل ہے۔ لیکن خالق حقیقی کی نعمتوں اور نوازشوں سے کون انکار کرسکتا ہے۔ جس نے انسان کو گندے پانی کے قطرے سے بنایا اور اسے زندگی کے مختلف ارتقائی منازل سے گزارا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے زندگی گزارنے کی آسائشیں دیں۔ احسن تقویم میں موجود ایک ایک نعمت پر ساری دنیا کی دولت ہزار بار نثار کرنے پر بھی صرف ایک آنکھ کا بدلہ نہیں چکایا جاسکتا۔

ان جملہ خداداد نعمتوں کا ایک اہم تقاضا یہ بھی ہے کہ انسان اپنے خدا کا شکر بجالائے۔ شکرگزاری کا طریقہ اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتا ہے۔ کہ اس کی نیابت کا حق ادا کرے۔ اور زندگی کے ہر مرحلہ میں اس کے رسول ﷺ کی پیروی کرے۔

(2) ملت بیضا کی تربیت:

روئے زمین پر جب سے انسان نے قدم رکھا۔ اور خلیفۃ اللہ کے منصب پر فائز ہوا۔ تو تہذیب وتمدن کے لحاظ سے انسان مختلف ارتقائی منزلوں سے گزرا۔ عمرانیات کا طالب علم اس امر سے بخوبی آگاہ ہے کہ دنیا میں مختلف ادوار میں کئی تہذیبیں ابھریں۔ اور پھر مٹ گئیں۔ خداوند کریم

نے ہر دور میں انسان کی اصلاح اور ہدایت کے مواقع بہم پہنچانے اور مختلف اوقات میں اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعے اپنا پیغام پہنچایا۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ط (بقرہ۔213)

ترجمہ۔سب لوگ ایک ہی جماعت تھے۔ پس اللہ نے نبیوں کو بھی خوشخبری دینے والے ڈرانے والے اور ان کے ساتھ حق کے ساتھ کتاب اتاری تا کہ لوگوں میں ان باتوں میں فیصلہ کیں جن میں ہم اختلاف رکھتے ہیں۔

تاہم انسانیت پر ان تعلیمات کا وہ دور رس اثر قائم نہ رہا جس سے انسانیت کو فلاح دارین کی ضمانت حاصل ہو سکے۔ اس مقصد کے لیے خداوند کریم نے اپنے آخری نبی ﷺ کو مبعوث فرمایا۔ تا کہ وہ ایک ایسی ملت کی اساس رکھیں اور اس کو تربیت بہم پہنچائیں۔ جو رہتی دنیا تک اس کام کی ذمہ داری قبول کر سکے۔ اور اسلام کو ابدی دین قرار دیا۔ اور اس کو دوسرے سب ادیان پر اپنی پسندیدگی کی مہر ثبت فرمائی اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (آل عمران۔ت 19) وحدت فکر انسانی کو قائم رکھنے کے لیے اسلام کو دین فطرت بنا کر امت وسطیٰ کو رہبری عالم کا کام سونپا۔ اس مقصد کو یوں بیان فرمایا:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ اَنِ الْمُنْكَرِ ط (آل عمران۔(104)

ترجمہ: اور چاہیے کہ تم میں سے ایک جماعت ہو۔ جو بھلائی کی طرف بلائیں اور اچھے کاموں کا حکم دیں اور برے کاموں سے روکیں۔

مختلف مذاہب کی پیروکار امتوں نے نہ صرف اپنے انبیاء کو جھٹلایا بلکہ سماوی تعلیمات میں بھی اپنی مرضی کے مطابق تحریف کر دی۔ جس سے ضرورت پیدا ہوئی کہ ایک ایسی ملت کی اساس رکھی جائے جو دین حق پر قائم اور خداوندی تعلیمات کی آمین ہو۔ اور اس کے ساتھ ساتھ مسلسل اشاعت اور تبلیغ کا کام بھی سرانجام دے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران۔110)

ترجمہ: تم سب سے اچھی جماعت ہو جو لوگوں کی بھلائی کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ تم اچھے کاموں کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو۔

الغرض ان آیات کی روشنی میں اسلامی تعلیمات کا دوسرا بڑا مقصد ایک ایسی امت کی بنیاد رکھنا اور اس کی عملی تربیت کرنا ہے۔ جو وحدت فکر انسانی کو قائم رکھتی ہو اور خیر کی مسلسل اشاعت و تبلیغ کی ذمہ داری

قبول کرے۔

الَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ط (حج۔ 41)

ترجمہ: یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین پر اقتدار عطا کریں تو نماز قائم کریں گے، اور زکوٰۃ ادا کریں گے۔ نیکی کا حکم دیں گے۔اور برائیوں سے منع کریں گے۔

(3) تعمیر انسانیت:

ارشاد خداوندی ہے: كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (بقرہ۔213) (سب لوگ ایک ہی قوم ہیں) اس آیت کی رو سے اسلام ہی ایک ایسا دین ہے۔ جو وحدت نسل انسانی کا داعی ہے۔ اور تفریق بین الناس کا سخت مخالف ہے۔قومی۔لسانی اور نسلی امتیازات کو جڑ سا کاٹتا ہے۔ وحدت نسل انسانی کا نظریہ وہ نظریہ ہے جس کی نظیر دوسرے انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات میں نہیں ملتی۔ اس ضمن میں ارشاد ہوتا ہے وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا (بقرہ۔143) ترجمہ: اور اس طرح ہم نے تم کو امت وسطی بنایا) امت وسطی سے مراد ایسا گروہ ہے جو افراط و تفریط سے پاک ہو۔ یہ وہی نظریہ ہے جس پر امن کی عمارت کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے (1) اسلام معاشرتی۔ سیاسی اور معاشرتی نظریات ص13۔

وحدت نسل انسانی کی توضیع و تشریح ان آیات سے بھی ہوتی ہے:

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّا اُمَّةً وَّاحِدَةً (یونس۔ت 19) (سب لوگ ایک ہی
قوم ہیں) اور اسی طرح خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ۔ ترجمہ۔ تم کو ایک
ہی اصل سے پیدا کیا گیا ہے) (نساء۔ت 1)

ہندوؤں کا ایمان ہے کہ برہما ان کا خدا ہے۔ یہودیوں کا نظریہ یہ
ہے کہ یہودہ صرف ان کا خدا ہے اور وہ اس کی محبوب ترین قوم
ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تو واضح فرمایا کہ:۔

"بنی اسرائیل کی گمشدہ بھیڑوں کے سوا کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا"

برعکس اس کے اسلام کا اعلان یہ ہے کہ انسان کی اصل ایک ہے اور
اسلام ساری انسانیت کو ایک وحدت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اور انسانیت
سے محبت کو خدا کی محبت کا ذریعہ گردانتا ہے۔

الخلق اعيال الله فاحب الخلق الى الله من احسن
الى عياله (بیہقی۔ کتاب الایمان)

ترجمہ: ساری مخلوق اعیال اللہ ہے اور اللہ اس سے محبت کرتا ہے
جو اللہ کی مخلوق سے سب سے زیادہ بھلائی کرتا ہے۔

اسی طرح:

التعظيم لا امر الله و الشفقة على عيال الله (بیہقی۔ کتاب الایمان)

ترجمہ: اللہ کے احکام کی تعظیم کرو اور اللہ کی مخلوق سے محبت رکھو۔

کسی نسلی۔ علاقائی۔ لسانی اور قومی تعصب سے ماوراء اسلام ہی ایک

ایسا دین ہے جو مخلوق اللہ سے محبت اور شفقت کا اعلان کرتا ہے۔ رشد و ہدایت کے سلسلے میں پہلے انبیاء کی تعلیمات نہ صرف محدود تھیں بلکہ علاقائی۔ لسانی اور قومی بنیادوں پر قائم تھیں۔ جس کے نتیجے میں دوسرے مذاہب عالم میں تعصب اور نسلی امتیازات کی واضح مثالیں آج بھی موجود ہیں۔ وحدت نسل انسانی کا پیغام اسلام نے دیا۔ اور حضور اکرم ﷺ کو ساری کائنات کا نبی بنا کر بھیجا گیا۔

كان النبی یبعث الی قومه خاصة بعثت الیٰ الناس عامة (بخاری و مسلم)

ترجمہ: مجھ سے پہلے ہر نبی کو اس کی مخصوص قوم کی طرف نبی بنا کر بھیجا جاتا تھا۔ لیکن میں تمام لوگوں کے لیے نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام اور دوسرے مذاہب کی نوعیت کار میں فرق موجود ہے۔ دوسرے انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کا مقصد کسی مخصوص قوم یا علاقہ میں موجود لوگوں کے عقائد میں درستی اور چند اعمال کی ترتیب رہا۔ برعکس اس کے اسلام کی عالمگیریت کا یہ حال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اعلان فرمایا الحمد للہ رب العالمین یعنی خدا صرف مسلمانوں کا ہی نہیں بلکہ تمام اقوام کا پروردگار ہے اور تمام مشرقین اور مغربین کا پالنے والا ہے۔ اور اس کی مقدس کتاب ''ھدً للناس'' روئے زمین کے لوگوں کے لیے ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ اور اسی طرح ''ذکر للعلمین'' کی حیثیت سے قرآن کریم تمام جہانوں

کے لیے نعمت ہے۔ اور حامل قرآن رسول مقبول ﷺ کو رحمۃ اللعالمین کے لقب سے ملقب فرمایا۔ ان اشارات کی رو سے اسلام کا مقصد ایک ایسی عالمگیر تہذیب کی بنیاد ڈالتا ہے۔ جس کی اندر بلا تخصیص نسل و قوم تمام انسانوں کی تعمیر کا سامان موجود ہو اور ساتھ ساتھ انسانی زندگی کے ہر پہلو کی تربیت مقصود ہے۔ جس میں ہر انسان خواہ بڑا ہو یا چھوٹا۔ جوان ہو یا بوڑھا۔ باپ ہو یا بیٹا۔ گورا ہو یا کالا۔ عربی ہو یا عجمی۔ جہاں ہو اور جس حیثیت کا حامل ہو اس کے اعمال و عقائد۔ اخلاق و اطوار اور اس کے حقوق و فرائض غرضیکہ ہر پہلو کی اصلاح و تربیت کرنا مقصود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تعلیمات میں انسانی زندگی کا کوئی ایسا پہلو اوجھل نہیں رہا جس کے لیے راہنمائی بہم نہ پہنچائی گئی ہو۔ چنانچہ انسانی زندگی کے ہر پہلو پہ محیط اسلامی تعلیمات کا بڑا مقصد یہ بھی ہے کہ انسانیت کی ایسی تعمیر نو کی جائے جس سے مخلوق اللہ سے محبت و شفقت دوسروں سے رواداری جیسی صفات پیدا ہوں۔ تا کہ پوری انسانیت ایک ایسے معاشرہ کو تشکیل دے سکے۔ جو ہر لحاظ سے پر امن بقائے باہمی کے اصول کو اپنا کر ایک خوشحال زندگی گزار سکے۔

(4) فکر آخرت:

اسلامی نقطۂ نظر سے تعلیم کا یہ بھی مقصد ہے کہ انسان کو دنیا کی زندگی میں آخرت کے لیے تیار کیا جائے۔ اسلام سے قبل تمام انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات میں آخرت یعنی روز قیامت سزا و جزاء کا تصور موجود تھا اسی لیے

انبیاء علیہم السلام کو مبشرین و منذرین کے القاب سے نوازا گیا۔قرآن نے اس دنیوی زندگی کو کھیل تماشا سے تشبیح دی ہے۔اور آخرت کے لیے اس زندگی میں زاد راہ بنانے کی تاکید کی ہے۔عقیدہ آخرت صرف مسلمانوں کے ایمان وایقان کا معاملہ نہیں۔ بلکہ دوسرے مذاہب کے پیروکار بھی کسی نہ کسی صورت میں اس پر یقین رکھتے ہیں۔ اور یہ امر واقع ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں بے مقصد پیدا نہیں کیا۔اور وہ شتر بے مہار بنا کر نہیں چھوڑا گیا۔ بلکہ اس کو عقل وشعور کی دولت دی گئی ہے۔ اور اس کو دوسری نعمتوں کے ساتھ ساتھ کچھ اختیارات سے بھی نوازا گیا۔ یہ سب کچھ دینے کے بعد اس پر مطلوبہ اعمال وکردار کی ذمہ داری بھی ڈالی گئی ہے۔چنانچہ اس بنا پر اس سے یہ پوچھا جائے گا۔کہ اس نے دنیا میں اس مقصد کے تحت زندگی گزارنے کے لیے کیا تگ ودو کی۔

عقیدہ آخرت کی وضاحت فرماتے ہوئے مولانا مودودی صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ

> ''عقیدۂ آخرت کے سوا کوئی دوسری چیز ایسی نہیں جو اس دنیا میں انسان کو راہ راست پر قائم رکھنے کی ضامن ہوسکتی ہو۔اگر کوئی شخص یہ نہ مانتا ہو کہ اسے مر کر دوبارہ اٹھنا ہے اپنے خدا کے حضور اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے۔تو وہ لازماً گمراہ اور بد راہ ہو کر رہے گا۔ کیونکہ اس کے اندر سرے سے وہ

احساس ذمہ داری پیدا ہی نہ ہوسکے گی۔ جو آدمی کو راہ راست پر ثابت قدم رکھتا ہے۔ کیوں کہ شیطانی قوتیں کبھی یہ پسند نہیں کرتیں کہ انسان آخرت کے عقیدۂ حیات پر ایمان رکھے۔ دنیا میں جو شخص بھی گمراہ ہوا اس انکار آخرت یا شک فی الآخرت کی وجہ سے ہوا ہے۔ اور جس نے بھی راست اولیٰ اختیار کی ہے۔ اس کے طرز عمل کی بنیاد آخرت پر ایمان ہے۔" (1)

گویا عقیدہ آخرت سے انسان کے دل میں اپنی ذمہ داریوں کے احتساب کا جو احساس پیدا ہوتا ہے وہ اس کے اعمال پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اور اپنی ذمہ داریوں کو بطریق احسن نبھانے کی سعی کرتا ہے۔ اس سے مثبت اعمال کی طرف رغبت پیدا ہوتی ہے۔ جس کا دوررس نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانی زندگی میں ایک توازن اور معاشرہ میں امن برقرار رہتا ہے۔

اسلام نے اخروی زندگی کو دنیوی زندگی پر ترجیح دی ہے۔ قرآن و سنت میں اس کی تشریح وتوضیح موجود ہے۔ اسلامی تعلیمات میں عقیدۂ آخرت کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ اس تصوّر سے موجودہ زندگی میں توازن اور معاشرہ میں سکون برقرار رہے بلکہ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ انسان اپنے اعمال کو ایسی صراط مستقیم پر استوار کرے کہ وہ اپنی آنے والی زندگی میں بھی کامیاب ہو اور فلاح دارین حاصل کرے۔

(1) تفہیم القرآن۔ مولانا مودودی جلد چہارم ص 195۔

علم کی تاکید واہتمام

علم کی فضیلت واہمیت کے پیش نظر یہ ضروری تھا کہ جس تعلیمی پالیسی پر حضور اکرم ﷺ عمل پیرا تھے۔ اس کے عملی اجراء کا اہتمام بہم پہنچایا جائے۔ اس سے قبل کہ کسی ایسی مثال کی طرف اشارہ کیا جائے جس میں تعلیم کے حصول کے لیے مکمل ترغیب وتاکید کی وضاحت موجود ہو۔ علم کے بارے میں آپ ﷺ کے ارشادات ملاحظہ ہوں۔

(1) بَلِّغُو عَنِّي وَلَوْ اٰيَةً (میری طرف سے پہنچادو اگرچہ ایک آیت ہو) کا مفہوم بخوبی سمجھ میں آ سکتا ہے۔ کہ علم کمتر صورت میں بھی قابل تعلیم ہے اور اس کو دوسروں تک پہنچانا بہر حال ضروری ہے۔ علم کی ترغیب میں یہ قول کہ

(2) مَنْ دَلَّ عَلٰی خَيْرٍ فَلَهٗ مِثْلُ اَجْرِ فَاعِلِهٖ (جس نے کسی اچھی بات کی طرف راہنمائی کی تو اس کے لیے اس کے کرنے والے جیسا اجر ہوگا) کسی کو کچھ علم سکھانا جس سے سیکھنے والا نفع حاصل کرے۔ ان اعمال میں قرار دیا گیا ہے۔ جو انسان کی موت کے بعد بھی جاری رہتے ہیں اور ان پر اجر ملتا رہتا ہے۔

اِذَا مَاتَ الْاِنْسَانَ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلَهُ اِلَّا مِنْ ثَلٰثَةٍ مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ اَوْعِلْمٍ يُنْفَعُ بِهٖ اَوْوَلَدٌ صَالِحٌ يَدْعُوْلَهٗ

(جب انسان مرجاتا ہے تو اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے۔ سوائے تین کے۔ صدقہ جاریہ۔ وہ علم جس سے کہ نفع حاصل کیا جائے نیک بیٹا جو اس کے لیے دعا کرے)

علم کی تحصیل کے لیے ایک دعا قرآن مجید میں یوں آئی ہے:

رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا (اے میرے رب میرے علم میں ترقی فرما) بحر علم کی بیکرانیوں کا اشارہ اس ارشاد میں ملتا ہے: وَفَوْقَ کُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِیْم (اور ہر علم والے سے ایک بڑھ کر علم والا ہے)

ان ارشادات عالیہ میں علم وحکمت کی تاکید ورغبت کا عنصر موجود ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ قرآن مجید میں بھی واضح طور پر احکام موجود ہیں۔ اسلامی آداب، تہذیب اور قرآنی علوم میں جب مسلمانوں کی فکر پختہ ہو گئی۔ تو اس وقت آخری عہد نبوی ﷺ میں لازمی تعلیم کا اعلان وحی خداوندی کے ذریعے ہوا۔ سورۃ توبہ کی جو اہمیت سلسلہ نزول وحی اور تاریخ اسلام میں ہے۔ اس کے بیان کرنے کا یہ محل نہیں۔ مختصراً یہ کہ اس سورۃ کے ذریعے اسلامی حکومت کے نظام کے مکمل ہونے اور اسلامی احکام وعبادات کے تکمیل پذیر ہونے کا اعلان حج کے موقع پر کیا گیا۔ اس سورۃ میں رسول اللہ کی وساطت سے مسلمانوں کو لازمی تعلیم کا حکم دیا گیا۔ چنانچہ ارشاد ہوا۔

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا كَافَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ ۝ (توبہ۔122)

ترجمہ: مگر ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کی آبادی کے حصے میں سے کچھ لوگ نکل کر (مدینہ) آتے اور دین سمجھ کر واپس جاتے۔ اور اپنے باشندوں کو خبردار کرتے۔ تاکہ وہ پرہیز کریں۔"(1)

اب ہم اسی ذیلی عنوان کے دوسرے پہلو یعنی اہتمام کی طرف آتے ہیں۔ پچھلی سطور میں کسی جگہ عرض کیا گیا تھا۔ کہ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں جس نظام تعلیم کے اساسی تصورات جن پر مابعد اس پورے انقلابی نظام کی عمارت استوار ہوئی۔ مدنی زندگی میں اس پر باقاعدگی سے کام شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں مسلمانوں نے نہایت قلیل عرصہ میں عسکری کامرانیوں کے ساتھ علمی میدانوں میں بھی معرکے سر کرنے شروع کر دیئے اور بہت جلد علمی میدان میں مسلمان صحابہ رضی اللہ عنہم کی تعلیم یافتہ کھیپ تیار ہو گئی۔ یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی۔ فیضان نظر کے ساتھ مکتب کا ہونا بھی ضروری تھا۔ لہذا تعلیم و تدریس کے سلسلے میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اہتمام فرمایا اس کے مطابق تعلیم و تبلیغ کے سب سے پہلے داعی خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعثت کے فوراً بعد

(1) سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم جلد چہارم ص370۔

اس کو سر انجام دینا شروع کر دیا تھا۔ آنحضرت ﷺ مکہ میں جب تک تشریف فرما رہے بنفسِ نفیس اس فرض کو انجام دیتے رہے۔ ایک ایک کے پاس جاتے اور حق کا پیغام سناتے۔ شہر سے نکل کر مکہ کے آس پاس جاتے اور آنے جانے والوں کو بشارت سناتے مکہ سے نکل کر طائف تشریف لے گئے اور وہاں بھی اپنا فرض ادا کیا۔'' (1)

جس وقت اللہ تعالیٰ حضور اکرم ﷺ کو نبوت کے منصب پر سرفراز فرمایا تو سب سے پہلے ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے کلمہ طیبہ پڑھ کر دعوت اسلام قبول کی اس طرح سب سے پہلے اسلامی تحریک کی ابتداء گھر سے ہوئی اگلا قدم گھر کے دیگر افراد کو دعوت اسلام دینا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ جو آپ ﷺ کے زیر کفالت تھے اور آپ ﷺ کے آزاد کردہ غلام اور خادم خاص حضرت زید رضی اللہ عنہ تھے۔ اسلام کے اس حصار کے یہ تین اسمائے گرامی اولین محافظ تھے۔ گھر سے باہر آپ ﷺ نے اس شخص کو دعوت دی جو آپ ﷺ کے بچپن کا دوست ہمدم، ہمراز اور دوسرے لوگوں سے زیادہ آپ ﷺ کے صدق، حق گوئی، عدل و انصاف اور محبت انسانی کا معترف تھا۔ وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شخصیت میں توازن اور وقار تھا۔ جنہیں مستقبل میں اکابرین صحابہ کا مرتبہ حاصل کرنا تھا۔ ان سابقین الاولین میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ۔ حضرت

(1) اسلامی تعلیم نومبر دسمبر 1972 ص 303۔

عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ۔ حضرت ارقم رضی اللہ عنہ، حضرت سعید بن زبیر رضی اللہ عنہ اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ زیادہ مشہور ہیں۔ ان سب فعال اور پرجوش شخصیتوں کی خفیہ سرگرمیوں کی وجہ سے کچھ اور لوگ جو اس تحریک میں شامل ہوئے ان میں زیادہ ممتاز یہ شخصیات ہیں۔ حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن بلال رضی اللہ عنہ۔ حضرت عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہما ازدی۔ حضرت ابو حذیفہ بن عتبہ رضی اللہ عنہ اور حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ کے نام نامی شامل ہیں۔ ابتداء میں جن خواتین نے اسلام قبول کیا ان میں ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ حضرت ام الفضل رضی اللہ عنہا (زوجہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ)، حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہ، اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہما اور فاطمہ بنت الخطاب رضی اللہ عنہا شامل ہیں۔

مکہ میں دعوت اسلام کی یہ تحریک تین برس تک خفیہ طریقے سے چلتی رہی۔ اس عرصہ میں اس تحریک کا مرکز حضرت ارقم رضی اللہ عنہ کا گھر تھا۔ جو شہر سے دور کوہ صفا پر واقع تھا۔ اور اس قسم کی زیرزمین سرگرمیوں کے لیے موزوں تھا۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی انقلاب پسند جماعت کے ارکان جو تقریباً چالیس کے قریب تھے جمع ہوتے تھے۔ اپنی اپنی سرگرمیوں کی روئداد سنانے، دشمنوں کے منصوبوں اور پروپگنڈے کو غیر موثر بنانے کے لیے مشورے کرتے۔ نیا لائحہ عمل بنتا۔ اور قائد تحریک اسلام سے ہدایت لیتے نماز کا وقت آتا تو یہیں نماز باجماعت بھی ادا کی جاتی۔

تحریک کا چرچا ہوا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بہنوئی حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ اور ان کی بیوی حضرت فاطمہ بنت الخطاب رضی اللہ عنہا، نیز ان کے قبیلہ کے ایک اور رکن حضرت نعیم بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ ایمان لائے۔ ان نو وارد مسلمانوں کی تعلیم اور قرآن سکھانے کے لیے حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ مقرر ہوئے۔ جو حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کے گھر جایا کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبول اسلام کا عظیم واقعہ اسی گھر میں پیش آیا تھا۔

قرآن کریم کا ایک اپنا اعجاز ہے اور قریش مکہ بھی اہل ذوق تھے۔ اس لیے اپنے ذوق کی تشفی کے لیے وہ قرآن حکیم کو سننے کا اشتیاق بھی رکھتے تھے۔ لیکن وہ دوسروں کی نظروں سے بچ کر اس کو سنتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ قرآن مجید کا سننا اسلام کی طرف رغبت اور میلان پر دلالت کرتا تھا۔ اس لیے سامعین معاشرہ میں مشتبہ نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا گھر بالخصوص قرآن خوانی کا مرکز تھا۔ اس کے صحن میں ایک مسجد بھی تھی جہاں مسلمان باجماعت نماز ادا کرتے۔ اور جب قرآن مجید کی قرأت ہوتی تو لوگ چھپ چھپ کر سنتے۔ ان پر ایک عجیب قسم کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ جو خشیت انگیز بھی ہوتی اور طمانیت آفرین بھی۔(1)

مکی زندگی میں تعلیم و تبلیغ کے جو اثرات پیدا ہو رہے تھے۔ ان میں حج کا موقع ایک بہترین موقع تھا۔ باہر سے آنے والے وفود حج میں آپ ﷺ

(1) پیغمبر اعظم و آخر از ڈاکٹر نصیر احمد ناصر۔ ص 303۔

نے خدا کا پیغام پہنچانا شروع کیا۔ قریش مکہ کی مخالفت اور کڑی نگاہ داشت کے باوجود باہر سے آنے والے لوگ اسلام کی دعوت پر دھیان دینے لگے۔ چنانچہ "بیت عقبہ کے بعد آپ ﷺ نے قبائل یثرب کے ساتھ اپنے نائب کی حیثیت سے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا۔(1) جن کی تبلیغ سے اگلے سال کئی اہل مدینہ مشرف بہ اسلام ہوئے۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کا تقرر اسلام میں پہلا واقعہ تھا کہ کسی آدمی کو آپ ﷺ نے اپنے نائب کی حیثیت سے مقرر فرمایا ہو۔ بعد میں اس طریق کار پر تعلیم و تبلیغ کے سلسلے میں اس پر برابر عمل ہوتا رہا۔" مکہ میں آنحضرت ﷺ کے بعد عام مسلمانوں میں سب سے پہلے مبلغ اور داعی حق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ مکہ میں بہت سے معزز گھرانوں کے پر جوش نوجوان انہی کی تبلیغ سے اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی کوششوں سے دائرۂ اسلام میں آئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد اسلام کے دوسرے مبلغ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ ہیں جن کے مؤثر واعظوں کی کوششوں سے آنحضرت ﷺ کی ہجرت سے پہلے ہی مدینہ کے گھرانے توحید کے پرستار ہو گئے تھے۔(2)

(1) اسلامی تعلیم نومبر دسمبر ; 1972 ص 33-34۔

(2) سیرت النبی جلد چہارم ص 471۔

اسلام کی تحریک کو مختلف ادوار سے گزرنا پڑا۔ اس میں مظلومیت کا زمانہ اور مسلسل جنگ وجدل کا عہد بھی ہے۔ اور اس کے بعد امن وسکون اور مواعید خداوندی کا زمانہ بھی شامل ہے۔ اس عہد میں اسلام کا تعلیمی نظام منزلیں طے کرتا رہا اور جب کبھی آنحضرت ﷺ کو موقع ہاتھ لگا آپ ﷺ تعلیم کو مسلمانوں میں عام کرنے اور اہل مدینہ کو مکہ کے پڑھے لکھے لوگوں کے برابر لانے میں کوشاں رہے۔ اس امر کے ثبوت کی بہترین مثال مسلمانوں کی تعلیم کے اہتمام کا وہ واقعہ ہے جو جنگ بدر کے پیش آیا۔ "تعلیمی انقلاب کی سمت پہلا قدم جنگ بدر کے بعد اٹھایا گیا۔ کفار کو بدر میں شکست ہوئی۔ اور ان کے ستر کے لگ بھگ آدمی گرفتار ہوئے۔ کفار کے کچھ قیدی تو فدیہ لے کر چھوڑ دیئے گئے نادار قیدیوں کو حکم دیا گیا کہ وہ دس دس انصاری بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں تو انہیں رہائی مل جائے گی۔ لکھائی سکھانا ہی ان کا زر فدیہ ہوگا۔(1)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی" بچوں کی تعلیم کے معاونہ میں جنگ بدر کے قیدیوں کی رہائی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"رسول اللہ ﷺ نے ان قیدیوں سے عفو ودرگزر کا معاملہ فرمایا اور ان کا فدیہ قبول کیا۔ جو جتنا دولت مند ہوتا یہ فدیہ اسی کے بقدر لیا جاتا۔ جن کے پاس دینے کے لیے کچھ نہ ہوتا۔ آپ ﷺ اس کو اپنی طرف سے رہائی کا حکم فرماتے۔ غرض قریش نے

(1) سیرت النبی ﷺ جلد چہارم ص-377۔

اپنے بہت سے قیدی فدیہ دے کر آزاد کرائے۔ کچھ ایسے قیدی بھی تھے جن کا فدیہ نہیں ہو سکا۔ ان کا فدیہ آپ ﷺ نے یہ تجویز فرمایا کہ وہ انصار کے بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں ایک قیدی پر دس بچوں کی تعلیم ضروری قرار دی گئی۔ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اسی طریقہ سے تعلیم حاصل کی تھی۔ اس حکم میں علم کی جتنی قدر دانی اور تعلیم کی جو اہمیت افزائی مضمر ہے اس کے توضیح کی شاہد ضرورت نہیں۔'' (1)

جنگ بدر مسلمانوں کے سیاسی اور تہذیبی بقاء کی پہلی اور آخری فیصلہ کن جنگ تھی۔ سیاسی اہمیت سے ہٹ کر اگر اس کے تہذیبی اثرات کو مدنظر رکھا جائے تو مسلمانوں کی تاریخ کا کوئی مورّخ اس واقعہ کو آج تک نہیں بھولا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس جنگ کے قیدیوں سے بطور فدیہ ناخواندہ مسلمانوں کو لکھنا، پڑھنا سکھانے کو خاص اہمیت دی تھی۔ سچ پوچھیئے تو یہی واقعہ ہماری تاریخ میں تعلیمی فکر اور علمی شغف کی وہ اساس ہے جس پر ہمارے تعلیمی نظام کی ساری عمارت قائم ہوئی ہے۔

آخری وحی وتنزیل اور احادیث طیبہ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ کا بنیادی وظیفۂ نبوت۔

لوگوں کی تعلیم و تربیت اور ان کے جذبۂ عبودیت کی تشفی کا مستقل بنیادوں پر بندوبست کرنا تھا۔

(1) نبی رحمت حصہ اول۔ ص 225۔

چنانچہ مدینہ منورہ میں تحریک اسلام کو آزاد ماحول میسر آیا تو آپ ﷺ نے سب سے پہلے تعلیم وتربیت کے مسئلے کو مستقل اور پائیدار بنیادوں پر حل کرنے کی طرف توجہ فرمائی۔ آپ ﷺ کی پیغمبرانہ حکمت وبصیرت کا یہ فیصلہ ہوا کہ تعلیم وتربیت کا مرکز ایسا ہونا چاہیے جہاں پر روز مقررہ اوقات پر مسلمانوں کا اجتماع ہوا کرے اور اس اجتماع کی حیثیت فرض و وجوب کی ہو۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے آپ ﷺ نے ''مسجد'' کو منتخب کیا۔ اس اعتبار سے مسجد نبوی ﷺ اسلام کا پہلا مرکز تعلیم وتربیت تھا۔ جس کے لیے آج کی زبان میں جامعہ یا یونیورسٹی کی تعبیر اختیار کی جا سکتی ہے۔ اس یونیورسٹی کا نصاب تعلیم وتربیت کیا تھا؟ (تفصیل بعد میں آئے گی) اس کے ذریعے آپ ﷺ نے ثقافتی مسئلے کو کیسے مستقل بنیادوں پر حل فرمایا؟ اس کا جواب قرآن مجید نے ہر زماں ومکاں کے انسان کی رشد وہدایت کے لیے اپنے اندر محفوظ کر لیا ہے۔ اور وہ یہ ہے۔

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ۔ (البقرہ 2-151)

ترجمہ: جس طرح ہم نے تم میں سے ایک رسول بھیجا ہے جو تمہیں ہماری آیات پڑھ پڑھ کر سناتا، تمہارا تزکیہ کرتا تمہیں الکتاب (قرآن مجید) اور حکمت سکھاتا اور تمہیں ان باتوں کی

تعلیم دیتا ہے جن کا تمہیں (پہلے) علم نہ تھا۔

چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لیے آپ ﷺ نے مسجد نبوی ﷺ کے ایک کنارے پر ایک جگہ مخصوص کر لی تھی جسے اس کے سائبان کی وجہ سے صفہ کہتے تھے۔ یہ دراصل یہ ایک کھلی اقامتی درس گاہ تھی جس میں ہر چھوٹا بڑا شخص تعلیم و تربیت حاصل کرسکتا تھا۔ چاہیے وہ اس میں اقامت گزیں ہو یا نہ ہوا۔ مسلمانوں کی ایک جماعت جنہوں نے اپنی کل زندگی تحریک اسلام کے لیے وقف کردی تھی تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے لیے اس میں اقامت گزیں ہو گئی۔ انہیں اصحاب صفہ رضی اللہ عنہم کہتے تھے۔ اس اعتبار سے اگر مسجد نبوی ﷺ کی اس درس گاہ کو عصر حاضر کی اقامتی یا کھلی درس گاہ کا پیش خیمہ سمجھا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ اس درس گاہ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں بچے اور پیر و جوان، نیز عورتوں کی تعلیم و تربیت کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ البتہ یہ بات قابل لحاظ ہے۔ کہ تعلیم نسواں کا علیحدہ بندوبست کیا گیا تھا۔(1)

ریاست مدینہ میں تعلیم کے شعبے میں یہ ایک ابتدائی کوشش تھی۔ اس کے بعد اس کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا۔ اور باقاعدہ اس شعبے کی تنظیم کی گئی۔ ”رسول اللہ ﷺ نے اپنے عہد میں سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کو مدینہ کا انسپکٹر جنرل تعلیمات مقرر کیا۔ جس کے سپرد لکھنے پڑھنے کا کام تھا۔ جیسا کہ ہم دیکھیں

(1) پیغمبر اعظم و آخر۔ مولفہ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر۔ ص۔ 416-417۔

گے کہ ان کی ذمہ داریوں میں وقت گزرنے کے ساتھ بتدریج اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس لیے اس کا انتظام چلانے کے لیے ایک علیحدہ افسر تعلیم حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا۔ یہ انتظامات تا حیات نبوی ﷺ قائم رہے۔ مدینہ میں کل نو مساجد تھیں۔ ان سب میں تعلیم و تدریس کا شغل جاری رہتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ وقتاً فوقتاً تشریف لے جاتے تھے اور اکثر اوقات درس میں شریک ہوتے تھے۔ صفہ اور مسجد نبوی ﷺ کو یونیورسٹی کہ اعلیٰ تعلیمی درسگاہ کی حیثیت حاصل تھی۔ مدینہ جو مختلف بستیوں کا مجموعہ تھا ہر بستی کے لوگ اپنی اپنی درس گاہ میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوتے تھے۔ اور بعض امور کے لیے مسجد نبوی ﷺ میں آتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے ایک انصاری پڑوسی نے اس غرض کے لیے مسجد نبوی ﷺ میں تعلیم حاصل کرنے کی باری مقرر کر رکھی تھی۔ ایک دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ آتے اور دوسرے دن ان کا انصاری پڑوسی آتا۔ تعلیم و تعلم کا یہ سلسلہ مدینہ کی ہنگامہ خیز زندگی میں برابر جاری رہا۔" (1) رسالت مآب ﷺ کی حیات طیبہ کے آخری سالوں میں اسلامی حکومت کی حدود پھیل چکی تھیں۔ اور جس کا رقبہ تقریباً دس لاکھ مربع میل پر مشتمل تھا۔ اس کے جملہ انتظامی اور سیاسی انتظام سے قطع نظر رسول خدا ﷺ کو نہ صرف اہل مدینہ کی تعلیم کی فکر تھی۔ بلکہ سربراہ مملکت کی حیثیت سے آپ ﷺ سارے ملک میں اس تعلیمی انقلاب کے اثرات کو دیکھنا چاہتے تھے۔ جس کی ابتدا آپ ﷺ بعثت کے فوراً بعد کر چکے تھے۔

(1) اسلام تعلیم (ص 35-36)

مرکز اسلام میں موجود رسمی مدارس اور مساجد جن میں تعلیم و تدریس کا کام ہوتا تھا۔ اس کی نگرانی آپ ﷺ شخصی طور پر فرماتے تھے۔ دور دراز کے علاقوں میں اعمال کی تقرری کے وقت تعلیم و تدریس کے سلسلے میں خصوصی ہدایات جاری فرماتے تھے۔ "صوبہ دار اور گورنروں کے فرائض منصبی میں یہ امر صراحت کے ساتھ شامل کر دیا جاتا تھا۔ کہ وہ اپنے ماتحت علاقے کی تعلیمی ضرورتوں کا مناسب انتظام کریں۔ یمن کے گورنر عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کے نام جو طویل تقرر نامہ یا ہدایت نامہ جناب رسالت مآب ﷺ نے لکھا تھا۔ اسے تاریخ نے محفوظ کر رکھا ہے۔ اس میں گورنر کو ہدایت ہے۔ کہ لوگوں کے لیے قرآن، حدیث۔ فقہ اور علوم اسلامیہ کی تعلیم کا بندبست کریں۔"(1) اسی طرح دوسرے صوبوں میں اور خصوصاً صوبہ یمن میں آنحضرت ﷺ نے ایک صدر ناظر تعلیمات مقرر کیا تھا۔ جس کا کام یہ تھا کہ مختلف اضلاع و تعلقات میں ہمیشہ دورہ کرتا رہے۔ اور وہاں کی تعلیم اور تعلیم گاہوں کی نگرانی کرے۔ کوئی تعجب نہیں کہ اور صوبوں میں بھی اس طرح کے افسر مامور کیے گئے ہوں۔"(2) سورۃ حج کی حسب ذیل آیات کی تشریح کے حوالے سے علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضور اکرم ﷺ کے علمی اہتمام اور اس کے ثمرات کا ذکر کرتے ہوئے تعلیم و تعلم کے فرض کی بطریق احسن ادائیگی کا ذکر کیا ہے۔

(1) ترجمان اہلسنت ص 34۔
(2) ترجمان اہلسنت ص 46۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ (حج۔41)

ترجمہ: وہ لوگ جن کو ہم زمین میں اگر طاقت دیں۔ تو نماز قائم کریں۔ زکوٰۃ دیں۔ اچھی باتوں کا حکم دیں اور بری باتوں سے روکیں۔

اس بناء پر ہر مسلمان واعظ بھی ہوتا تھا اور محتسب بھی۔ داعئ مذہب بھی اور ماہر شریعت بھی۔ یہی وجہ ہے کہ یا تو اسلام سے پہلے عرب میں اس قدر جہالت پائی جاتی تھی کہ شرفاء کا لکھنا پڑھنا عیب خیال کیا جاتا تھا۔ یا ایک ایک گھر فقہ۔ حدیث اور تفسیر کا دار العلم بن گیا۔ تاہم ہر شخص کو تفقہ و تدریس کا کافی وقت نہیں مل سکتا تھا۔ اس لیے یہ ضروری قرار دیا گیا کہ جماعت اور قبیلے میں کچھ ایسے لوگ موجود ہوں جو تعلیم و ارشاد کا فرض انجام دے سکیں۔ (1)

تاریخ اور کتب سیر کے بغور مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ داعئ اسلام حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی سراسر مصائب و آلام کی زندگی تھی۔ جب یہ کٹھن دور ہجرت مدینہ پر منتج ہوا تو جہاں مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا وہاں ساتھ ہی ایک مسلسل جد و جہد کا دور شروع ہوا اس دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کئی اہم مسائل درپیش تھے۔ سب سے پہلا مقصد ایک

(1)۔ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم جلد دوئم ص 87۔

مثالی ریاست کا قیام تھا۔ جس کے ابتدائی خدوخال یہود اور دوسرے قبائل کے ساتھ میثاق مدینہ سے شروع ہوئے۔ اور مدینہ میں ایک پرامن فضا کے قائم رکھنے کی داغ بیل ڈالی گئی۔ دوسرا بڑا مسئلہ مدینہ کے دفاع اور مشرکین مکہ کے ممکنہ حملوں کا تدارک کرنا تھا۔ اس کے ساتھ آپ ﷺ کے پیغمبرانہ منصب کا یہ بھی تقاضا تھا۔ کہ اسلام کی دعوت کا کام بھی مسلسل جاری رکھا جائے۔ یہ سارے پہلو بیک وقت آپ ﷺ کے پیش نظر تھے یہود مدینہ کی بدعہدی اور منافقین کے عزائم بھی پیش نظر تھے۔ ان حالات سے نپٹنے کے لیے مدینہ میں مسلمانوں کو ہر وقت ہنگامی حالات کا سامنا تھا۔ اور مسلمانوں کو ہر وقت جہاد کے لیے تیار رہنا پڑتا تھا۔ ان تمام مسائل کے باوجود مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کا کام جاری رہتا تھا۔

مسلمانوں کے لیے قریش سے دس سالہ امن کا سمجھوتہ (صلح حدیبیہ) ہو جانے کا مطلب ان کی طرف سے ایک مستقل، قریبی اور حقیقی خطرے کا ٹل جانا اور جزیرہ نمائے عرب کی تسخیر کی راہ ہموار ہو جانا تھا۔ چنانچہ ادھر سے فراغت ملتے ہی آپ ﷺ نے اپنے رسالتی مشن کی تکمیل یعنی تحریک اسلامی کو عالمگیر بنانے کی خاطر اسے بیرونی ممالک سے روشناس کرنے کی کوششوں کا آغاز کر دیا۔ یہ اہم حقیقت ہمیشہ ہمارے پیش نظر رہنی چاہیے کہ آپ ﷺ تمام نبی نوع انسان کے لیے پیغمبر اور تمام جہانوں کے لیے رحمت بن کر مبعوث ہوئے تھے۔

یہ زمانہ بادشاہت، شہنشاہیت، سرداری، وسرمایہ کاری اور جاگیرداری نظام کا تھا۔ لہذا اس عہد کے عوام کا دین، دین مملوک ہوتا تھا۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وسائل، اور حالات ومقتضیات کے مطابق شہنشاہوں اور ان کے حکام اعلیٰ کو اسلام کی دعوت دی اور اپنے سفیروں کے لیے انہیں خطوط بھجوائے۔ کتب سیر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ دعوت نامے من وعن محفوظ ہیں۔ یہاں ان کا ذکر اس ذیلی عنوان کے تحت اس لیے کیا جاتا ہے کہ دعوت نامے بھی اسلامی تحریک کی اشاعت وتبلیغ کا ایک اہم ذریعہ تھے۔ یہ دعوت نامے جہاں بھی پہنچے زیادہ تر ان کا مثبت ردعمل ہوا۔ اور تحریک اسلام کا تعارف جزیرہ نمائے عرب سے نکل بیرونی ممالک میں پہنچا۔ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر یہی مقصد کارفرما تھا کہ اس تحریک کو عالمگیر بنایا جائے۔ یکم محرم 7ھ / 11 جولائی 628ء کا عہد آفرین دن تھا۔ کہ پیغمبر اعظم وآخر صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو جمع کیا اور خطبہ فرمایا۔

> "اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے مجھے جہانوں کے لیے رحمت اور پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔ دیکھو! عیسیٰ علیہ اسلام کے حواریوں کی طرح اختلاف نہ کرنا۔ اٹھو اور میری طرف سے پیغام پہنچاؤ"۔

بعد ازاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی دن میں چھ حکمرانوں کے نام دعوت اسلام کے خطوط لکھوا کر سفیروں کے ذریعے بھجوائے۔ ان کے نام یہ ہیں۔

(1) حضرت دحیہ بن خلیفۃ الکلبی رضی اللہ عنہ ...... قیصر روم

(2) حضرت عمرو بن امیہ الضمر ی رضی اللہ عنہ...... نجاشی بادشاہ حبشہ

(3) حضرت عبداللہ بن حزافہ سہمی رضی اللہ عنہ...... خسرو پرویز، شہنشاہ ایران

(4) حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ...... عزیز مصر

(5) حضرت سلیط بن عمرو عامری رضی اللہ عنہ...... روسائے یمامہ

(6) حضرت شجاع بن دھب الاسدی رضی اللہ عنہ...... حارث غسانی رئیس حدود شام

اس ضمن میں دو باتیں قابل لحاظ ہیں۔

(1) کہ ان میں سے ہر سفیر اس ملک یا علاقے کی زبان جانتا تھا۔ جہاں اسے بھیجا گیا تھا۔

(2) 7ھ تک مدینہ منورہ میں نظام تعلیم و تربیت اس قدر ترقی کر گیا تھا۔ کہ خارجی تعلقات قائم کرنے میں آپ رضی اللہ عنہ کو کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔

عالم یا معلّم کا مقام

تعلیم کے عمل میں استاد یا معلّم مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔ کوئی نظام تعلیم خواہ قدیم ہو یا جدید اس کردار کو پس پشت ڈال کر اپنے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کر سکتا۔ علوم و معارف کا تسلسل اور ان کے انتقال و اتصال کا واحد ذریعہ معلّم ہے۔ اس لیے ہر نظام تعلیم میں اس کی تربیت اور پیشہ ورانہ زندگی میں اس کی مناسب حوصلہ افزائی بہتر نتائج کی حامل ہو سکتی ہے۔ کوئی قوم حتی الامکان اس امر سے غافل نہیں ہوتی کہ وہ اپنے معلّمین اور علماء کو اپنے معاشرہ میں بہتر مقام دے۔ لیکن اسلام نے اس پیشہ کی تقدیس اور قدر و منزلت کا جو اہتمام کیا ہے۔ وہ کسی دوسرے نظام میں موجود نہیں۔ اسلام نے معلّمی کے پیشے کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ حضور اکرم ﷺ کے وہ ارشادات اور اقوال جن کی روشنی میں علماء کے مقام کی تعین ہوتی ہے۔ حدیث کی کتابوں میں بکثرت موجود ہیں۔

اسلام کی رو سے سب سے پہلا اور اوّل معلّم اللہ تعالیٰ کی ذات خود ہے۔ اس نے آدم علیہ السلام کو اشیاء کا علم سکھایا۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا (البقرہ۔2-31)

ترجمہ: اور آدم علیہ السلام کو سب چیزوں کے نام سکھائے۔ اس علم کی

وجہ سے آدم مسجود ملائکہ بنا۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوْا لِآدَمَ فَسَجَدُوْا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ط

(البقر۔2-34)

ترجمہ: اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے نہیں کیا۔

علم کو پھیلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو مخلوق کی طرف بھیجنا شروع کیا نبی کریم ﷺ جو مظہر الوہیت اور تمام انبیاء علیہم السلام کے جمیع اوصاف کے جامع تھے ان کی بعثت کی غرض و غایت اللہ تعالیٰ یوں بیان فرماتا ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْ الْاُمِّيِّيْنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ آيَاتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ ۔(آل عمران۔3-164)

ترجمہ: خدا نے مومنوں پر بڑا احسان کیا ہے انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے۔انہیں پاک کرتا ہے۔اور انہیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔اور وہ پہلے کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔

صاحب علم آدمی کی فضیلت بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ۔

(الزمر 39-9)

کہہ دو کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہو سکتے ہیں۔

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا مِنكُمْ وَالَّذِيْنَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ ط وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيْرٌ ۝ (المجادلہ -58-11)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے درجات بلند کرے گا۔ جو تم میں سے ایمان لائیں گے اور جنہیں علم دیا گیا اللہ تعالیٰ اس سے جو تم کرتے ہو خبردار ہے۔

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ ط اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ (فاطر -35-28)

ترجمہ: اللہ سے صرف اس کے علم والے ڈرتے ہیں۔ اللہ غالب بخشنے والا ہے۔

بَلْ هُوَ اٰيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ط (العنکبوت-29-49)

ترجمہ: بلکہ وہ ان لوگوں کے سینوں میں کھلی آیات ہیں جنہیں علم دیا گیا ہے۔

فَسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ

ترجمہ: تم علم والوں سے پوچھو اگر تمہیں علم نہیں۔

قُلْ رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا

ترجمہ: کہ اے میرے رب میرا علم بڑھا۔

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا۔ (البقرہ-2-269)

ترجمہ: جس کو حکمت دی گئی ہے اس کو خیر کثیر دی گئی ہے۔

احادیث نبوی ﷺ میں علماء کے جو فضائل بیان کیے گئے ہیں۔ وہ

حسب ذیل ہیں:

(1) فَضْلَ الْعَالِمَ عَلٰی عَابِدٍ کَفَضْلِی عَلٰی اَدْنَاکُمْ(1)

ترجمہ: عالم پر عابد کی فضیلت ایسی ہے۔ جیسے میری ﷺ فضیلت تم میں سے سب سے ادنیٰ پر۔

(2) وَاِنَّ الْفَضْلَ الْعَالِمَ عَلَی الْعَابِدِ کَفَضْلَ الْقَمْرِ لَیْلَةِ الْبَدْرِ عَلٰی سَائِرِ الْکَوَاکِبِ وَاِنَّ الْلمَآءَ وَرِثَةِ الْاَنْبِیَآءِ وَاِنَّ الْاَنْبِیَآءِ لَمْ یُوْرِثُوْا دِیْنَارًا وَّلَا دِرْھَمًا وَلٰکِنْ وَّدِثُوْالْعِلْمَ فَمَنْ اَخَذَہٗ بِحَظٍّ وَّافِرٍ (ابوداؤد وترمذی)(2)

ترجمہ: اور عالم کو عابد پر ایسی فضیلت ہے جیسی چودھویں رات کے چاند کو تمام تاروں پر اور عالم نبیوں ﷺ کے وارث ہیں۔ انبیاء کی میراث نہ دینار تھا۔ نہ درہم۔ ان کی میراث علم تھی۔ پس جس نے وہ حاصل کیا۔ اس نے بہت حصہ حاصل کیا۔

(3) اِنَّ اللّٰہ تَعَالٰی وَمَلٰئِکَتَہٗ عَلَیْھِمُ السَّلَامِ وَاَھْلِ السَّمٰوٰت وَاَھْلَ الْاَرْضِ حَتّٰی اَنَّمْلَةُ فِیْ حُجْرِ ھَا وَالْحِیْتَانَ فِی الْبَحْرِ یُصَلُّوْنَ علٰی مُعَلِّمِ النَّاسِ اَلْخَیْرَہ (ترمذی)(3)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے ان پر سلام ہو۔ اور آسمان اور زمین کے رہنے والے یہاں تک کہ چیونٹیاں اپنی بلوں میں

(1) فیوض الباری فی شرح صحیح بخاری ص 260۔

(2) بحوالہ انتخاب صحاح ستہ ص 151۔

(3) فیوض الباری فی شرح صحیح بخاری ص 260۔

اور مچھلیاں سمندر میں اس شخص کے واسطے جو لوگوں کو نیکی کی تعلیم دیتا ہے۔ رحمت کی دعا کرتے ہیں۔

(4) وَاللّٰهُ لَاَنْ يُّهدابِهُداكَ رَجُلٌ وَّاحِدٌ خَيرٌ لَّكَ مِنْ حُمْرِ النَّعَمِ (ابوداؤد)(1)

ترجمہ: خدا کی قسم اگر تمہاری ہدایت سے ایک شخص بھی ہدایت پا گیا۔ تو یہ تمہارے لیے سرخ اونٹ سے بہتر ہے۔

(5) نَضَّرَ اللّٰهُ اِمْرَءًا سَمِعَ مِنَّا شَئيًا فَبَلَّغَهُ كَمَا سَمِعَهُ فَرُبَّ مُبَلَّغ اَدْعٰى مِنْ سَامِعٍ (ترمذی)(2)

ترجمہ: خدا اس آدمی کو آباد رکھے جس نے ہم سے کوئی بات سنی اور پھر ہو بہو آگے سنا دی۔ کیونکہ جن لوگوں کو پیغام پہنچتا ہے۔ ان میں سے اکثر پیغام پہلے سننے والے کی نسبت زیادہ یاد رکھتے ہیں۔

(6) فَقِيهٌ وَاحِدٌ اَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ اَلْفِ عَابِدٍ (ترمذی)(3)

ترجمہ: ایک عالم شیطان پر ہزار عابد سے سخت تر ہے۔

(7) مُعَلِّمُ الْخَيرِ يَسْتَغْفِرُلَهُ كُلِّ شَيءٍ (ترمذی)(4)

ترجمہ: معلم خیر کے لیے تمام چیزیں دعائے مغفرت کرتی ہیں۔

(8) اَلْعَالِمُ وَالْمُتَعَلِّمُ شَرِكَانِ فِي الْاَجْرِ (ابن ماجہ)(5)

(1) انتخاب صحاح ستہ ص 157۔
(2) انتخاب صحاح ستہ ص 158۔
(3) انتخاب صحاح ستہ ص 157۔
(4) بحوالہ فن تعلیم و تربیت ص 83۔
(5) بحوالہ فن تعلیم و تربیت ص 83۔

ترجمہ: عالم اور متعلم اجر میں دونوں شریک ہیں۔

(9) وَاَنَّ الْعُلَمَاءَ هُمْ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَآءِ وَرَّثُوا الْعِلْمَ مَنْ اَخَذَهٗ اَخَذَ بِحَظٍّ وَّافِرٍ (1)

ترجمہ: اور علما انبیاء کے وارث ہیں۔ اور انبیاء نے ورثہ علم میں چھوڑا جس نے علم حاصل کیا۔ اس نے پورا حصہ حاصل کیا۔

ان فضائل کے ساتھ ساتھ اشاعت علم کے لیے علماء کو خبردار کیا گیا کہ وہ اپنے علم کو دوسروں تک پہنچانے میں کسی بخل سے کام نہ لیں اور علم پر کسی قسم کی برہمنیت کی اجارہ داری کو یہ فرما کر ختم کیا کہ

مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمٍ عَلِمَهٗ ثُمَّ كَتَمَهٗ اُلْجِمَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ بِلِجَامٍ مِّنَ النَّارِ۔ (ترمذی۔ابوداؤد) (2)

"جو شخص پوچھنے پر جاننے کے باوجود صحیح بات نہیں بتائے گا۔ قیامت کے دن اس کے منہ میں آگ بھر دی جائے گی۔"

فضائل علم اور علماء اور صلحاء امت کے بارے وہ حدیثیں جو ہمارے ہاں روزمرہ کی گفتگو میں ضرب المثل بن چکی ہیں۔ ان کا اندارج بھی فائدہ سے خالی نہیں۔

(1) علماء پیغمبروں کے وارث ہیں۔ (احیاء)

(2) پیغمبروں کے بعد علماء اور مجاہدین کا درجہ ہے۔ (احیاء)

(1) فیوض الباری فی شرح صحیح البخاری ص 248۔ (بخاری)

(2) فیوض البخاری فی شرح صحیح البخاری ص 248۔

(3) قیامت کے دن علماء کی روشنائی اور شہداء کا خون ایک ہی درجے میں ہوں گے۔ (صبح الاعشاء)

(4) اس مسلمان کی کوئی قدر و قیمت نہیں جو نہ استاد ہے اور نہ طالب علم۔ (محاضرات الادبا)

(5) بلا تاخیر ایک جاہل کو علم کی تلاش میں لگ جانا چاہئے اور ایک عالم معتبر کو اپنے علم میں اضافہ کرنا چاہیے۔ (کشف الظنون)

(6) مہد سے لحد تک تلاش علم جاری رکھو خواہ اس کے لیے چین جانا پڑے۔ (کشف الظنون)

(7) علم حاصل کرنا مسلمان (مرد اور عورت) پر فرض ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح)

(8) رسول اکرم ﷺ دو مجلسوں میں سے گزرے۔ جو مسجد میں منعقد تھیں آپ ﷺ نے فرمایا دونوں مجلسیں بھلائی پر ہیں۔ لیکن ان میں ایک دوسری سے بہتر ہے ان دونوں جماعتوں میں سے ایک عبادت میں مصروف ہے۔ اور خدا سے دعا کر رہی ہے اور اس سے اپنی خواہش کا اظہار کر رہی ہے۔ وہ چاہئے ان کو دے چاہے نہ دے۔ مگر دوسری مجلس علماء کی ہے دین کی سمجھ حاصل کر رہے ہیں اور جاہلوں کو سکھا رہے ہیں۔ لہٰذا یہ لوگ بہتر ہیں اور میں بھی معلّم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ یہ کہہ کر آپ ﷺ بھی اس مجلس میں بیٹھ گئے۔ (مشکوٰۃ المصابیح کتاب العلم)

اس طرح معلّمین کو اپنے علم کے عوض کسی قسم کا معاوضہ لینے سے منع

فرمایا۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ کہ مجھے صفہ کی درس گاہ عالیہ میں قرآن اور فن تعلیم دینے کے معاوضے میں ایک شاگرد نے کمان نذر کی۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے روک دیا۔

معلّمین کی قدر افزائی کی کئی اور مثالیں عہد نبوی ﷺ میں ملتی ہیں۔ جن میں بیر معونہ میں جن معلّمین کو دھوکے سے شہید کیا گیا تھا۔ آنحضرت ﷺ کو ان کی شہادت کا بڑا دکھ ہوا۔ آپ ﷺ مسلسل ایک ماہ بیس دن تک قاتلین پر لعنت فرماتے رہے۔ اصحاب صفہ کی مختلف طریقوں سے حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ معلّم القرآن حضرت سالم مولیٰ حذیفہ رضی اللہ عنہ کے متعلق آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اگر آج سالم زندہ ہوتا تو میں اسے مسلمانوں کا خلیفہ بناتا۔''

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو معلّم قرآن ہونے کی وجہ سے یمن جیسے اہم صوبہ کا عامل مقرر کیا۔ اور صوبے کی تعلیمی اور تبلیغی سرگرمیوں کا انچارج مقرر کیا گیا۔ عہد نبوی ﷺ اور راشدین رضی اللہ عنہم کے عہد میں علم کی اہلیت پر ملکی عہدے دیئے جاتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مفسر قرآن حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو کوفہ کا قاضی مقرر کیا۔ اور تعلیم ہی کو سرکاری عہدوں کا معیار مقرر کیا گیا۔ الغرض اسلام نے علماء اور معلّمین کا جو مقام متعین کیا ہے۔ اس کا اثر آج تک باقی ہے اور مسلم معاشرہ میں علماء کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

نصاب تعلیم

قومی روایات اور تہذیب و ثقافت کو آئندہ نسلوں میں منتقل کرنا تعلیم کے اہم مقاصد میں شامل ہے۔ تعلیم کا ایک مقصد حالات حاضرہ کے ساتھ مطابقت پیدا کر کے وقت کے بدلتے ہوئے رجحانات کا ساتھ دینا بھی ہوتا ہے۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے ایک طریق کار تجویز کیا جاتا ہے جس کو تعلیمی اصطلاح میں "نصاب" کہتے ہیں۔ جہاں تک عرب قوم کی روایات اور ثقافت کا تعلق ہے وہ ایک بہادر قوم تھی۔ مہمان نواز تھی۔ اور اسی قسم کی دوسری خوبیوں سے متصف تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ گوناگوں برائیوں کا شکار بھی تھی۔ مجموعی طور پر سارے معاشرے پر ان برائیوں کا اثر غالب تھا۔ ان کا معاشرہ جہالت کی پیداوار تھا۔ حضور اکرم ﷺ اسلام کے ہمہ گیر انقلاب کے ساتھ پورے معاشرے کو تبدیل کرنا چاہتے تھے۔ لہذا عربوں کی وہ اقدار جو اخلاقی اور روحانی معیار پر پوری نہیں اترتی تھیں۔ ان کو تبدیل کرنا ضروری تھا اور اچھی اقدار کو برقرار رکھنا مقصود تھا۔ ایسے حالات میں یکسر تبدیلی کی بجائے بتدریج تبدیلی کا اصول اپنایا گیا۔ عہد نبوی ﷺ کا معاشرہ ایک ترقی پذیر معاشرہ تھا۔ جس میں آئے دن خداوند

کریم کی رہنمائی میں نئے نئے تقاضوں سے نپٹنے کے لیے تجربات ہو رہے تھے۔ جس کا مقصد رہتی دنیا تک انسانیت کو ایک مکمل ضابطۂ حیات دینا تھا۔ اس لیے عہد نبوی ﷺ کے مروجہ نظام تعلیم میں کسی مخصوص عمر، درجہ یا گروہ کے لیے نصاب مقرّر نہیں تھا۔ بلکہ ان سرگرمیوں میں ہر عمر اور ہر قسم کے مسلمان شامل تھے۔ تاہم تعلیم و تدریس کے عمل میں نفسیاتی پہلو کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا تھا۔

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر نے سورہ بقرہ کی آیت نمبر 151 کو بنیاد بنا کر عہد نبوی کے نصاب تعلیم کو اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس آیت کا ترجمہ کچھ اس طرح ہے۔

''جس طرح ہم نے تمہیں میں سے ایک رسول بھیجا ہے۔ جو تمہیں ہماری آیات پڑھ پڑھ کر سناتا ہے۔ تمہارا تزکیہ کرتا۔ تمہیں الکتاب (قرآن مجید) اور حکمت سکھاتا ہے اور ان باتوں کی تعلیم دیتا ہے۔ جس کا تمہیں علم نہ تھا۔'' (البقرہ2-1511)

اس سے معلوم ہوا کہ اس اسلامی یونیورسٹی کا نصاب اصولی طور یہ تھا۔(1)

(1) قرأت قرآن

(2) تزکیہ

(3) تعلیم کتاب

(1) پیغمبر اعظم و آخر۔ ص 416۔

(4) تعلیم حکمت

(5) علوم نو کی تعلیم

چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لیے آپ ﷺ نے مسجد نبوی ﷺ کے کنارے ہر ایک جگہ مخصوص کر لی۔ جسے اس کے سائبان کی وجہ سے صفہ کہتے تھے۔ یہ دراصل ایک کھلی اقامتی درس گاہ تھی۔

(1) قرأت قرآن:

چونکہ اس نصاب میں اوّلیت قرآن کو حاصل تھی۔لہٰذا طلباء کو سب سے پہلے قرأت قرآن سکھائی جاتی تھی۔ اس سے مقصود تھا۔ کہ طلباء کا قرآنی تلفظ درست ہو جائے وہ قاری اور حافظ بن جائیں۔ مسلمانوں کو چونکہ اسلام کی تحریک انقلاب کا فصیح البیان مبلغ بنانا مقصود تھا۔ اس لیے انہیں قرآن مجید کی بلیغ زبان اور حسین انداز بیان کی تعلیم دی جاتی تھی۔ چونکہ آپ ﷺ ہی نے پہلے معلّم کی حیثیت سے یہ فرض انجام دینا تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو تمام اہل عرب سے زیادہ فصیح البیان بنایا تھا۔ علم وادب کے ارتقاء میں ذوق لسانی کے کردار کی اہمیت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اسلام کی اس پہلی یونیورسٹی میں ذوق لسانی پیدا کرنے کو اوّلین اہمیت دی جاتی تھی۔ تاریخ سے ثابت ہے۔ کہ اس یونیورسٹی نے ایسے بے بدل قاری اور خطیب پیدا کیے جنہوں نے دنیا میں خطابت کا معیار قائم کیا۔

(2) تزکیہ:

بحیثیت معلّم انسانی آپ ﷺ کا دوسرا فریضہ لوگوں کا تزکیہ کرنا تھا۔ انسان کی فطری استعداد یں قوت کی صورت میں ودیعت ہوتی ہیں۔ جو قدرت نے اس کی شخصیت کی تکمیل اور زندگی کی کامیابی کے لیے ودیعت کر رکھی ہیں جس طرح انسانی قلب کو بیماری یا بیماریوں سے نجات دلا کر صحت مند اور توانا بنانا اور اس کی فطری استعدادوں کو قوت سے فعل میں لانا اور ان کی تربیت کرنا تا کہ ان کے نشو وارتقاء کا سلسلہ شروع ہو جائے یا جاری رہے تزکیہ کہلاتا ہے۔ اس کے لیے تزکیہ نفس یا تزکیہ قلب کی تعبیرات میں اختیار کی جاتی ہیں۔ اس اعتبار سے تزکیہ نفس سے قلب کے تصفیہ و اصلاح کا وہ طریق عمل مراد ہے۔ جس کے ذریعے ذہنی انتشار اور زندگی پر دباؤ کو دور کر کے اس کی فطری صلاحیتوں کو فطری اور مثبت انداز میں نشو وارتقاء حاصل کر نے کے قابل بنانا ہے۔ نیز اس مفہوم میں اخلاق کی تہذیب و تحسین اور مکارم اخلاق کی تکمیل بھی شامل ہے۔

(3) تعلیم کتاب:

صفہ یونیورسٹی کے نصاب کا تیسرا مضمون تعلیم قرآن تھا۔ علم قرآن کا مبداء جیسا کہ اس کا اپنا ارشاد ہے۔ علم الٰہی ہے جو علم انسانی کا سر چشمہ ہے۔ لہٰذا ''الکتاب'' قرآن حکیم کی تعلیم دینے کا مقصد انسان کو حقیقی علم سکھانا تھا۔ قرآن مجید کی مثال ایک ایسے شجر طیبہ کی ہے۔ جو زمانے کے

تقاضوں کے مطابق مسلسل برگ و بار لاتا رہتا ہے۔ اور ہمیشہ لاتا رہے گا۔ اور یہ انسان کا فرض ہے کہ تعلیم و تربیت اور غور و فکر کے ذریعے اس کے بوقلموں اور نو بنو ثمرات سے ہمیشہ استفادہ کرتا رہے۔

آپ ﷺ اپنے طلباء (اصحابہ کرام رضی اللہ عنہم) کو زمانے کے تقاضوں اور ان کی استعداد کے مطابق قرآنی علوم اور حکمت کی تعلیم دیتے تھے۔ معلّم انسانیت کی حیثیت سے آپ ﷺ کی عظمت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ صحرائے کے بدوی، اور ان پڑھ اعرابی دیکھتے ہی دیکھتے عالم و فاضل اور مفکر اور حکیم بن گئے۔ آپ ﷺ نے مسجد نبوی میں جو شمع روشن کی تھی آپ ﷺ کے شاگردوں کے ذریعے اقصائے عالم میں پھیل گئی۔

(4) حکمت:

اس نصاب کا چوتھا مضمون حکمت کی تعلیم تھا۔ علم کی مثال برقی رو جیسی ہے۔ اور اس سے روشنی حاصل کرنا حکمت ہے۔ اس اجمال کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔ کہ بجلی پیدا کرنے والی مشین برقی رو پیدا کرتی ہے۔ لیکن اس سے فائدہ اسی صورت میں اٹھایا جا سکتا ہے کہ برقی قمقموں کے ذریعے اس سے روشنی اور متحرک آلات کے ذریعے اس سے توانائی حاصل کی جائے اور ایسا کرنا حکمت کہلاتا ہے۔

اسی اعتبار سے علم و حکمت لازم و ملزوم ہیں۔ اور اسی لیے قرآن مجید میں علم کے ساتھ حکمت کی تعلیم کو لازمی قرار دیا ہے۔ علم اور تجربے کے

باعث انسانی ذہن میں جو بصیرت پیدا ہوتی ہے حکمت کہلاتی ہے۔ لیکن انبیاء علیہ السلام کے براہ راست خداداد علم کی وجہ سے ان کی بصیرت عام انسانوں کے مقابلے بدرجہ اتم ہوتی ہے۔ اس لیے انبیاء کی صحبت اور توجہ کے اثرات سے انسانی بصیرت کی نشو و ارتقاء بڑی تیزی سے وقوع پذیر ہوتی ہے۔

(5) علوم نو کی تعلیم:

اسلام نظام تعلیم کے پانچویں مضمون سے متعلق قرآن مجید نے بڑی فکر انگیز و حکیمانہ بات کہی ہے۔ کہ آپ ﷺ اپنے طلباء کو ان باتوں کی تعلیم دیتے تھے جو وہ پہلے نہیں جانتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے نصاب تعلیم میں زمانے کے لحاظ سے جدید و نئے علوم وفنون بشمول ٹیکنالوجی وغیرہ داخل ہیں اس ارشاد الٰہی میں علم کے ارتقائے مسلسل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور ہدایت کی گئی ہے کہ اسلامی درس گاہوں میں تحقیق و تجربات کا جدید انتظام موجود ہونا چاہیے نیز طلباء کو دوسری اقوام کی تحقیقات اور تجربات سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ آپ ﷺ نے اس حکم الٰہی پر عمل کرتے ہوئے عصری تقاضوں کے مطابق یقیناً ایسے علوم وفنون سیکھنے کی بھی ترغیب دی جو وقت کی اہم ضرورت تھی۔ یہودیوں کے ساتھ واسطہ بڑا تو عبرانی زبان سیکھنے کی اجازت دی گئی۔ سفارتی تعلقات قائم کرنے کے لیے جزیرہ نما عرب سے باہر ممالک میں بولی جانے والی زبانوں کو سیکھنے کا

اہتمام کیا گیا۔ عہد نبویؐ میں مسلمانوں کو جہاد وقتال سے واسطہ پڑا اس لیے فن حرب کے سیکھنے اور اس کے لیے ہمہ وقت تیار رہنے کی ضرورت اس عہد کا ایک اہم تقاضا تھا۔ چنانچہ اس سلسلے عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں عسکری تربیت بھی شامل نصاب تھی اس لیے اس کا علیحدہ عنوان کے تحت احاطہ کیا جاتا ہے۔

(6) عسکری تربیت:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا حق الیقین تھا۔ کہ اسلام کی انقلابی تحریک کو عرب کی استحصالی قوتیں زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکیں گی اور انہیں ان کی جارحیت کا مقابلہ کرنا ہوگا لہذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد ہی کو فوج کا صدر مقام (ہیڈ کوارٹر) بنا کر مہاجرین اور انصار کی عسکری تربیت کا آغاز کر دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان پر اسلام کے نقطۂ نظر سے جہاد کی اہمیت وفضیلت واضح کرتے انہیں جنگ و جہاد اور موت وشہادت کے فرق سے آگاہ کرتے اور تعلیمات قرآنی اور وعظ ونصیحت کے ذریعے ان میں جذبہ جہاد پیدا کرتے تاکہ انکا عسکری نظام مضبوط بنیادوں پر قائم ہو جائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مثالی سپہ سالار اور ماہر حربیات کی طرح عسکری تربیت میں مجاہدین کے لیے مشق ومداولت کا ایک ایسا رضا کارانہ نظام قائم کیا جو اپنی امتیازی خصوصیت کے باعث کم خرچ اور موثر ثابت ہوا آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجاہدین کو مسلسل ومتواتر عسکری مشق ومزاولت کرتے رہنے کی تلقین فرماتے رہتے تھے۔ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کے مطابق مروجہ ہتھیاروں مثلاً تیر اندازی، نیزہ

بازی، شمشیر زنی اور گھڑ سواری کی مشق کرنا ان کا معمول بن گیا۔ آپ ﷺ مروجہ ہتھیاروں میں تیراندازی کی اہمیت پر بہت زور دیتے تھے اور مجاہدین کو اس فن میں مہارت حاصل کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔ اس سلسلے میں آپ ﷺ کی دو ارشادات نقل کئے جاتے ہیں۔

"اللہ تعالیٰ ایک تیر کے ذریعے تین شخصوں کو جنت میں داخل کرے گا۔ ایک تیر ساز، جسے اپنے اس عمل میں خیر کی امید ہو۔ دوسرا تیرانداز، اور تیسرا وہ شخص جو اس کی معاونت کرنے والا ہو۔ لہٰذا تم تیراندازی اور گھڑ سواری کی مشق کرو اور ہاں تمہاری گھڑ سواری سے زیادہ مجھے تمہاری تیراندازی عزیز ہے۔" (1)

"جس شخص نے تیراندازی سیکھی اور پھر اسے چھوڑ دیا۔ تو اس نے نعمت پانے کے بعد اسے ٹھکرا دیا۔" (2)

بنو عذرہ کے ایک نومسلم حضرت حمزہ بن نعمان رضی اللہ عنہما کو ان کی خدمات اور وفا داری کے پیش نظر حضور اکرم ﷺ نے وادی القریٰ میں ایک وسیع اراضی پر مشتمل قطیعہ عطا فرمایا تھا۔ جہاں ان کا گھوڑا دوڑ سکتا تھا۔ اور وہ خود تیراندازی کی مشق کر سکتے تھے۔ (3)

مخصوص نصابی سرگرمیوں میں مسلمانوں کے لیے قرآن و حدیث کی تعلیم و تجوید القرآن، فقہ، علم ہیئت اور علم الانساب شامل نصاب تھے۔

(1) پیغمبر اعظم و آخر ص 424 بحوالہ ابن ماجہ۔
(2) پیغمبر اعظم و آخر ص 424 بحوالہ طبرانی۔
(3) نقوش رسول نمبر جلد پنجم ص۔ 696۔

جب اسلامی ریاست کو سفارتی امور کو نپٹانے کی ضرورت پڑی تو آنحضرت ﷺ نے غیر ملکی زبانیں سیکھنے کا حکم بھی دیا۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہما کو عبرانی زبان سیکھنے کا حکم ملا۔ اور اسی طرح دوسرے مسلمانوں نے غیر ملکی زبانیں سیکھیں اور ان ممالک میں تبلیغ اسلام کو جاری رکھا۔ "یثرب میں یہودیوں کی ایک ایسی درس گاہ جس کا نام بیت المدارس تھا۔ رسول خدا کی ہجرت کے وقت بھی موجود تھی۔ اس دانش گاہ سے رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو عبرانی و دیگر علوم سیکھنے کا حکم دیا تھا۔" (1)

خوش نویسی (تحریر) مسلمانوں کے نصاب میں شامل تھی

سعید بن العاص رضی اللہ عنہما بڑے خوش نویس تھے۔ "اصحاب صفہ رضی اللہ عنہم" کو جو تعلیم دی جاتی تھی اس میں لکھنا بھی شامل تھا۔ چنانچہ حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہما قرآن مجید کے ساتھ لکھنے کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ (2) علم کے مختلف میدانوں میں بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہ نے کمال حاصل کیا۔ اور وہ دوسرے لوگوں کو تعلیم دیتے تھے۔ رسول ﷺ اللہ نے قرآن کے چار بڑے معلّمین کو علم کی سند عطا فرمائی۔ ان میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما۔ ابی بن کعب رضی اللہ عنہما۔ سالم مولیٰ حذیفہ رضی اللہ عنہ اور معاذ بن جبل انصاری رضی اللہ عنہ شامل ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کو قرآن کے علاوہ حدیث سکھانے اور احکامات سے استنباط کرنے کی بھی اجازت مرحمت فرمائی۔ (3)

(1) اسلامی تعلیم نومبر دسمبر 1972ء ص 37۔
(2) سیرت النبی ﷺ جلد دوم ص 91۔
(3) اسلامی تعلیم نومبر دسمبر 1972ء ص 40۔

عہد نبوی ﷺ کے نظام تعلیم میں نصاب تعلیم لچکدار تھا۔ جس قسم اور جس وقت کے حالات اور تقاضے سامنے آتے تھے۔ ان کے مطابق ان کے حل تلاش کرنے کا طریق کار وضع کر لیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر گھوڑے اس وقت نہایت جنگی اہمیت رکھتے تھے۔ اس لیے گھڑ سواری اور دوڑ کی مشقیں کی جاتی تھیں۔ ان کے باقاعدہ مقابلے ہوتے تھے۔ سکھلائے ہوئے گھوڑے الضاء سے ثنیہ الوداع تک دوڑائے جاتے تھے۔ جنگی حالات کے پیش نظر اسلحہ سازی کی تربیت بھی دی جاتی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے منجنیق۔ دبابہ اور دیگر قلعہ شکن آلات کی تعلیم کے لیے چند صحابہ رضی اللہ عنہم کو جرس بھیجا۔ اس طرح جنگی ہتھیار بنانے کے کارخانے لگوانے کے لیے ماہرین کو یمن وغیرہ بھیجا۔ جنگ خندق میں خندق کی کھدائی کے سلسلہ میں مسلمانوں نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے تجربات اور علم سے فائدہ اٹھایا۔ تربیت جسمانی کی طرف خاص توجہ دی جاتی تھی۔ پیراکی اور نشانہ بازی بھی شامل نصاب تھی۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ عہد نبوی ﷺ کی نصابی سرگرمیوں کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''نصاب کا مسئلہ ایسا مسئلہ ہے کہ اس میں پوری صحت کے ساتھ بیان کرنا دشواری سے خالی نہیں۔ ہمارے پاس جو مختلف اور محدود مواد ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہر جگہ ایک ہی نصاب جاری نہ تھا۔ معینہ کتب کو پڑھانے کی جگہ معینہ معلّم کے پاس لوگ جاتے اور جو کچھ پڑھا سکتا۔ اس سے

پڑھتے۔ بہر حال اتنا معلوم ہوتا کہ قرآن وسنت کے ہمہ گیر نصاب کے علاوہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا کہ نشانہ بازی۔ پیراکی۔ تقسیم ترکہ کی ریاضی۔ مبادی طب۔ علم ہئیت۔ علم الانساب اور علم تجوید القرآن کی تعلیم دی جایا کرے۔(1)

نصاب تعلیم کی ان چند مخصوص سرگرمیوں سے قطع نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور روزمرہ کا پاکیزہ ماحول ایک درس گاہ کی مانند تھا۔ اور اس کی جامعیت اور وسعت کا کمال یہ تھا۔ کہ اس میں داخلہ کے لیے۔ امتیاز رنگ ونسل۔ ملک و وطن اور زبان ولہجہ کا سوال نہ تھا۔ بلکہ وہ دنیا کے تمام خانوادوں۔ تمام قوموں۔ تمام ملکوں اور تمام زبانوں کے لیے عام تھی۔ درس گاہ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے جو دور رس نتائج برآمد ہوئے ان سے دنیا آگاہ ہے۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے فیضان نظر اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتب کی کرامت یہ تھی کہ اس میں زندگی کے ہر شعبہ میں ایسے نابغہ روزگار اشخاص تربیت یافتہ ہوئے جنہوں نے دنیا کی تقدیر کو بدل ڈالا۔ سید سلیمان ندوی کی الفاظ میں۔

”عقلائے روزگار اور اسرار فطرت کے محرم دنیا کے جہاناں اور ملکوں کے فرمانروا اس درس گاہ سے تعلیم پا کر نکلے ہیں۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہیں۔ عثمان غنی رضی اللہ عنہ ہیں۔ علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ ہیں۔ اور معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ ہیں جنہوں نے

(1) عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں نظام تعلیم ص 17-16۔

مشرق و مغرب تک ، افریقہ سے ہندوستان کی سرحد تک فرمانروائی کی۔"(1)

دوسری طرف خالد بن ولید رضی اللہ عنہما۔ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہما۔ ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہما۔ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما جیسے نامور فاتح اور سپہ سالار ہیں۔ جنھوں نے چند سالوں میں مشرق ومغرب کی عظیم عالمی سلطنتوں کے مرقع الٹ دیئے۔ باذان بن ساسان رضی اللہ عنہما (یمن) خالد بن سعید رضی اللہ عنہما (صفاء) مہاجرین امیہؓ (کندہ) زیاد بن لبید رضی اللہ عنہما (حضرموت) عمرو بن حترم رضی اللہ عنہما (نجران) یزید بن سفیان رضی اللہ عنہ (تیماء) علاء بن حضری رضی اللہ عنہما (بحرین) جیسے ماہر منتظم اور خدا ترس گورنر جنھوں نے صوبوں اور شہروں کی کامیاب حکومت کر کے خلق خدا کو آرام و آسائش اور عدل و انصاف سے متعارف کرایا۔ علماء اور فقہاء کی صف میں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما۔ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما۔ عبداللہ بن بن عمر رضی اللہ عنہما ابن العاص۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہما۔ ابی بن کعب رضی اللہ عنہما۔ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما۔ زید بن ثابت رضی اللہ عنہما اور ابن زبیر رضی اللہ عنہما جیسے جلیل القدر اصحاب شامل ہیں۔"(2)

(1) خطبات مدراس ص 107۔

(2) خطبات مدراس ص 107۔

اسی طرح ارباب روایات وتاریخ کی صف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہما۔ حضرت ابو سعید حضری رضی اللہ عنہما۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہما۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما اور حضرت براء بن جاذب رضی اللہ عنہما وغیرہ سینکڑوں اصحاب شامل ہیں۔

جہان دیدہ، بہادر اور اہل الرائے مدبرین کی جماعت میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ۔ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ۔ حضرت مقداد رضی اللہ عنہ۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہما۔ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہما۔ اسید بن حضیر رضی اللہ عنہما۔ اسد بن زرارہ رضی اللہ عنہما اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ جیسے نابغہ روز گار اشخاص شامل ہیں۔(1)

(1) خطبات مدراس ص 110۔

درس گاہیں اور تعلیمی سرگرمیاں

یہ بات ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے کہ عہد نبوی ﷺ میں تعلیم کو عام کرنے کی جتنی بھی کوششیں کی گئی ہیں وہ صرف ابتدائی نوعیت کی تھیں۔ تاہم علوم وفنون کے حصول میں ترغیب اور اس کی فرضیت واہتمام کی جو بنیادیں رکھی گئیں۔ وہ دور رس نتائج کی حامل تھیں۔ جس پر آگے چل کر ایک ایسے نظام تعلیم کی بنیاد پڑی جس سے نہ صرف مسلمانوں کو فائدہ پہنچا بلکہ غیر مسلم اقوام بھی بہرہ ور ہوئیں۔ مسلمانوں کی آئندہ نسلوں نے علم وفن میں جو گرانقدر اضافے کئے ان کا اجمالاً ذکر تعلیمی انقلاب کے عنوان کے تحت گزشتہ صفحات میں گزر چکا ہے۔

عہد نبوی ﷺ میں رسمی درسگاہوں کے حوالے سے جب تاریخی جائزہ لیا جاتا ہے۔ تو یہ بات سامنے آتی ہے۔ کہ اسلامی نظام تعلیم میں مسجد کو مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اور ''صفہ'' کی درسگاہ کے علاوہ کسی رسمی درسگاہ کی نشاندہی مشکل ہے۔ مسجد ہی ایک ایسا مقام تھا جو سیاسی۔ ثقافتی اور تعلیمی سرگرمیوں کا محور رہا ہے۔ تاہم ''صفہ'' کی درسگاہ کو ایک رسمی اقامتی یونیورسٹی کی حیثیت حاصل ہے۔ جہاں عقائد۔ شہریت

اور اخلاق کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اور اس میں زیادہ تر وہ لوگ قیام کرتے تھے جو دنیاوی تعلقات سے آزاد ہو کر شب و روز زہد و عبادت اور زیادہ تر خدمت علم میں مصروف رہتے تھے۔

"اس وقت کی اصطلاح میں ان طالبان علم کو قراء کہتے تھے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں ہر جگہ یہی نام آیا ہے۔"(1)

عہد نبوی ﷺ کی اس اقامتی درسگاہ میں داخلہ کی چند مخصوص شرائط بھی تھیں۔ جن پر باقاعدہ عمل کیا جاتا تھا۔ "کتاب سیر میں لکھا ہے کہ ان لوگوں میں سے جب کوئی شادی کر لیتا تھا۔ تو اس جماعت سے نکل جاتا تھا۔ اور ان کی بجائے دوسرے لوگ داخل ہو جاتے تھے۔(2)

صفہ کی درسگاہ نہ صرف تعلیمی درسگاہ تھی بلکہ ایک تربیتی مرکز بھی تھا۔ طالبان علم کے علمی شغف کے راستے میں ان کی ناداری حائل نہیں ہوتی تھی۔ اور نہ وہ ریاست یا عوام پر بار گراں تھے۔ بلکہ وہ اپنے اخراجات کے خود کفیل ہونے کے ساتھ ساتھ خیرات اور اساتذہ کی خدمت بھی کرتے تھے۔ ذیل کے اقتباس سے ان کی تدریسی زندگی کا اندازہ ہوتا ہے:

"اصحاب صفہ اگرچہ اس قدر مفلس اور نادار تھے کہ کسی کے پاس ایک کپڑے سے زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ جس کو گردن سے باندھ کر گھٹنوں تک چھوڑ دیتے تھے۔ کہ چادر اور تہبند دونوں کا کام دیتا تھا۔ تاہم یہ لوگ پاؤں توڑ کر

(1) سیرت النبی ﷺ جلد دوم ص 89۔
(2) سیرت النبی ﷺ جلد دوم ص - 89۔

نہیں بیٹھتے تھے۔ بلکہ جنگل میں جا کر لکڑیاں چن لاتے تھے۔ ان کو بیچ کر آدھا خیرات کر دیتے تھے۔ اور آدھا اخوان طریقت میں تقسیم ہوتا تھا۔ اس بنا پر تعلیم و تدریس کا وقت رات کو مقرر کیا گیا بعض روائیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس درسگاہ کے معلّم، حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہما بھی تھے۔ جو مشہور صاحب علم تھے۔ اور جن کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے خلافت کے زمانے میں تعلیم فقہ اور قرآن کے لیے فلسطین بھیجا تھا۔ ابوداؤد میں حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔ کہ میں نے اصحاب صفہّ میں سے چند لوگوں کو قرآن مجید اور لکھنے کی تعلیم دی۔ اس کے صلہ میں مجھ کو ایک شخص نے کمان صلہ میں دی۔" (1)

صفہّ کی درسگاہ ایک اقامتی نوعیت کی تھی۔ جہاں تعلیم و تدریس کا حلقہ قائم تھا۔ لیکن عہد نبوی ﷺ میں حصول علم کا دائرہ وسیع تھا۔ جہاں لوگ اہل علم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی علمی پیاس بجھاتے تھے۔ "بعض روائیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ درسگاہ صفہّ کے علاوہ بھی کوئی جگہ تھی جہاں اصحاب صفہ رضی اللہ عنہم رات کو تعلیم پاتے تھے۔ مسند امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ میں ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اصحاب صفہ رضی اللہ عنہم میں سے ستر 70 اشخاص رات کو ایک معلم کے پاس جاتے تھے اور صبح تک درس میں مشغول رہتے

(1) سیرت النبی ﷺ جلد دوم ص 91-90۔

تھے۔(1) 'صفہ' کی رسمی درسگاہ کے علاوہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے ایک اور درس گاہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ جو دارالقراء'' کے نام سے مشہور تھی اور جو 2ھ میں مخرمہ بن نوفل کے مکان میں قائم ہوئی تھی۔'' اسلامی ریاست میں مدینہ کو مرکزیت حاصل تھی۔ کیونکہ حضور اکرم ﷺ کا مستقل قیام مدینہ میں تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ تعلیم کا مرکز بھی مدینہ ہی تھا۔ ابتدائی عہد میں دوسرے قبائل عرب میں مسلمانوں کی تعداد کم تھی۔ اس لیے مرکز کی حفاظت کے لیے زیادہ مسلم آبادی کی ضرورت تھی۔ اور مسلمانوں کو تھوڑے وقت میں زیادہ سے زیادہ اسلامی تعلیمات سے بہرہ ور کرنا بھی مقصود تھا۔ آبادی اور تعلیمی اشاعت کے مسئلے سے نپٹنے کے لیے حضور اکرم ﷺ نے باہر کے مسلمان قبائل کو مدینہ میں آباد ہونے کی ترغیب دی۔ اس لیے بہت سے بیرونی قبائل آ کر مدینہ میں آباد ہو گئے۔ حضور اکرم ﷺ کی اس ترغیب سے مدینہ کی آبادی میں اضافہ ہوتا گیا۔ اور لوگوں نے اپنے محلوں میں مسجدیں بنالیں۔'' اس بنا پر عرب کے بہت سے خاندان اپنے گھروں سے ہجرت کر کے مدینے چلے آئے تھے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ آئے تو اسی 80 اشخاص کو ساتھ لے کر آئے اور مدینہ میں آباد ہوئے۔ خلاصۃ الوفا سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ میں جہینہ وغیرہ قبائل کی الگ الگ مسجدیں تھیں۔ یہ وہی قبائل تھے جو ہجرت کر کے مدینہ آئے تھے اور چونکہ مسجد

(1) سیرت النبی ﷺ جلد دوم ص 91-90۔

نبوی ﷺ سب کے لیے کافی نہ تھی۔ اس لیے الگ الگ مسجدیں بن گئیں تھیں۔"(1)

مدینہ میں آبادی کی کثرت سے تعلیم و تبلیغ کا دائرہ بھی وسیع ہو گیا۔ اور مسلمانوں کو مسجد نبوی ﷺ کے علاوہ بھی مساجد تعمیر کرنا پڑیں جن میں تعلیم و تدریس کا کام بھی ہوتا تھا۔" ابوداؤد نے کتاب المراسل میں بسند لکھا ہے کہ صرف مدینہ کے اندر آپ ﷺ کے زمانہ میں نو مسجدیں تھیں۔ جہاں الگ الگ جماعتیں ہوتی تھیں۔

(1) مسجد بنی زریق

(2) مسجد بنی غفار

(3) مسجد اسلم

(4) مسجد جہینہ

(5) مسجد بنی عمرو

(6) مسجد بنی ساعدہ

(7) مسجد بنی عبید

(8) مسجد بنی سلمہ

(9) مسجد بنی راتج

ان کے علاوہ متفرق روایات میں مختلف قبائل کی بیس 20 اور مساجد کا پتہ چلتا ہے۔(2) تاہم مدینہ منورہ میں مسلمانوں کی کثرت آبادی

(1) سیرت النبی ﷺ جلد دوم ص 89-88۔

(2) سیرت النبی ﷺ جلد دوم ص 92۔

اور مختلف مساجد میں تعلیم و تعلّم کی موجودگی نے مسلمانوں کو تعلیم کے اصل منبع یعنی مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقطع نہیں کر دیا تھا بلکہ مسلمان اپنی جملہ مصروفیات کے باوجود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری دیتے تھے۔ اور براہ راست مستفید ہوتے تھے۔ اس سلسلہ میں بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایک خاص طریق کار اپنایا ہوا تھا۔ جس کی شہادت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس بیان سے ملتی ہے۔

"حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں اور میرا انصاری پڑوسی جو بنی امیہ بن زید میں سے تھا اور یہ قبیلہ مدینہ کے اوپر والے دیہات میں ہے۔ ہم دونوں یکے بعد دیگرے نوبت بہ نوبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آتے۔ ایک روز وہ آتا اور ایک روز میں خدمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں آتا۔ جب میں آتا تو اس دن کی ساری خبریں وحی اور غیر وحی کی اسے پہنچاتا۔ اور جب وہ آتا۔ تو وہ ایسا ہی کرتا۔" (1)

ہر اصلاحی تحریک اور مذہب کی مانند رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اس انقلابی تحریک کے خود سب سے عظیم اور اوّل معلّم تھے۔ اور ابتداء میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کا فریضہ انجام دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداء ہی سے اپنے قابل اصحاب کو اس طرح تعلیم و تربیت

(1) حیاۃ الصحابہ رضی اللہ عنہم جلد سوئم ص 221۔

دی تھی۔ کہ دوسروں کے لیے معلّم اور مشعل راہ بن سکیں تا کہ چراغ سے چراغ جلتے رہیں۔ مکی زندگی میں آپ ﷺ نے جن لوگوں کو براہ راست تعلیم وتربیت دی تھی آپ ﷺ کے دور میں آپ ﷺ کے اہل اصحاب رضی اللہ عنہم نے معلّم ثانی کا فریضہ انجام دیا اور واقعہ یہ ہے کہ نو مسلموں کی تعلیم وتربیت کا فریضہ آپ ﷺ اپنے اصحاب میں سے کسی کے سپرد کردیتے تھے۔ ہجرت کے زمانے تک قابل معلّمین کی تعداد معتدبہ ہوچکی تھی بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ مکی عہد میں جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی آپ ﷺ کی صحبت کا فیض کچھ مدت تک اٹھایا تھا وہ کندن بن گئے تھے۔(1) چنانچہ ہجرت سے قبل جب اہل مدینہ کی تعلیم وتربیت کے لیے کسی معلّم کی ضرورت پڑی تو رسول اللہ ﷺ کی نظر انتخاب عبدالدار قریش کے ایک نوجوان صالح اور قابل صحابی حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہما پر پڑی اور آپ ﷺ نے ان کو مدینہ بھیج دیا اس سے قبل اہل مدینہ کی تعلیم کا فریضہ حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہما نقیب النقباء کیا کرتے تھے ماخذ کا بیان ہے کہ تمام مدنی مسلمان ان کے گھر یا اس کے پہلو میں آباد مسجد خانہ میں جمع ہوتے تھے اور حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہما انکو مذہبی تعلیم دیا کرتے تھے۔ یہاں یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضرت مصیب بن عمیر رضی اللہ عنہما کے مدینہ آنے سے قبل خدانخواستہ مدنی مسلمانوں کی تعلیم کا انتظام ناقص تھا۔ یا حضرت اسعد رضی اللہ عنہم اچھے معلّم نہ

(1) ماہنامہ نقوش رسول نمبر جلد پنجم ص۔708۔

تھے۔ بلکہ اصل بات یہ تھی۔ کہ مسلمان نبی کریم ﷺ کے براہ راست فیض یافتہ اور تربیت کردہ صحابی سے تعلیم و تربیت کی سعادت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ دوسرنکتہ یہ ہے کہ اکثر مبلغین ہی معلّمین کے فرائض انجام دیتے تھے۔ کیونکہ معلّمین ہی معلم کی صلاحیتوں سے مالا مال ہوتے تھے۔ لیکن مخصوص حالات میں رسول کریم ﷺ مسلمانوں کے لیے ''معلّمین کا تقرر فرماتے تھے اس لیے اس بحث میں ہم ایسے ہی معلّمین کا ذکر بطور خاص کریں گے۔

صحیح بخاری کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ایک اور معلّم حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہما بھی تھے۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ ہجرت سے قبل حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہما اور حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہما لوگوں کو قرآن کریم پڑھایا کرتے تھے۔ اور خود راوی حدیث جو اس وقت چھوٹے تھے مفصل سورتوں میں سورہ الاعلیٰ'' ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہما سے سیکھی تھی۔ بلا شبہ ہجرت کے بعد بھی حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہما معلم کے فرائض بدستور سابق انجام دیتے رہے تھے کیونکہ وہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے بعد ہی مدینہ پہنچے تھے۔(1)

جب مکہ فتح ہوا۔ تو رسول کریم ﷺ کو اپنے وطن مالوف کے لوگوں کی دینی تعلیم و تربیت کی فکر دامن گیر ہوئی تمام ماخذ کا متفقہ بیان ہے۔ کہ

(1) ماہنامہ نقوش۔ رسول نمبر جلد پنجم ص۔ 708-709۔

آپ ﷺ نے مکہ کے نومسلموں کو قرآن حکیم سکھانے اور اسلام کی بنیادی تعلیمات بتانے کی خاطر دو عظیم صحابیوں حضرت معاذ بن جبل خزرجی رضی اللہ عنہما اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما کو بطور معلم وہاں چھوڑا تھا۔ اور انہوں نے خاص مدت تک یہ خوشگوار فرض انجام دیا تھا۔ اسی طرح طائف کے معاصرے کے دوران ثقیف کے جن غلاموں نے اپنے آقاؤں کا ساتھ چھوڑ کر اسلام کے دامن میں پناہ لی تھی۔ آپ ﷺ نے ان کو مختلف صحابہ کرامؓ کے دامن تربیت سے وابستہ کر دیا تھا۔ تاکہ ان کی صحیح اور مناسب دینی تعلیم اور مذہبی تربیت ہو سکے اس ضمن میں جن معلّمین کے نام نامی مذکور ہوئے ان کے نام یہ ہیں۔

(1) حضرت عمرو بن سعید اموی رضی اللہ عنہما۔

(2) حضرت خالد بن سعید اموی رضی اللہ عنہما۔

(3) حضرت ابان بن سعید اموی رضی اللہ عنہ۔

(4) حضرت عثمان بن عفان اموی رضی اللہ عنہ۔

(5) حضرت سعید بن عبادہ خزرجی رضی اللہ عنہ۔

(6) حضرت اسید بن حضیر اوسی رضی اللہ عنہما۔

یہ دلچسپ اور اہم حقیقت ہے۔ کہ مہاجرین میں سب کا تعلق بنوامیہ کے دو خاندانوں سے تھا۔ اور حضرت عثمان کے سوا سعیدی گھرانہ سے تھا جبکہ انصاری معلّمین میں سے ایک ایک کا تعلق مدینہ کے دونوں قبیلوں سے تھا۔

بالواسطہ سہی لیکن اس سے عہد نبوی ﷺ میں بنوامیہ کے علم و فضل اور اسلام میں پختگی کا پورا ثبوت ملتا ہے۔(1)

اصحاب صفہ کے علاوہ متعدد دوسرے اساتذہ و معلّمین کا ذکر ماخذ میں ملتا ہے ان میں سے وہ ممتاز ترین تھے جن سے قرآن حکیم وغیرہ کا علم حاصل کرنے کا حکم خود رسول کریم ﷺ نے دیا تھا۔ چنانچہ بخاری کی ایک روایت ہے۔ کہ آپ ﷺ مسلمانوں کو اپنے چار اصحاب حضرات عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما، سالم مولیٰ ابی خذیفہؓ، ابی بن کعبؓ اور معاذ بن جبلؓ سے قرآن کریم پڑھنے اور اسلام سیکھنے کا حکم دیا کرتے تھے اصابہ کا بیان ہے۔ کہ ایک نومسلم حضرت وردان رحمۃ اللہ علیہ جو بعد کی ایک مشہور شخصیت فرات بن یزید کے دادا تھے قران کریم کی تعلیم کے لیے حضرت ابان بن سعد اموی رضی اللہ عنہ کے حوالے کیے تھے اور یہ کام کسی اور نے نہیں کیا بلکہ رسول کریم ﷺ نے بنفس نفیس کیا تھا۔ اسی طرح کنزالعمال کی ایک روایت کے مطابق رسول اکرم ﷺ نے ایک نومسلم حضرت ابو ثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہما کو حضرت ابو عبیدہ بن الجراح قمری رضی اللہ عنہما کے دامن تربیت میں دیا تھا۔ اور فرمایا تھا۔ ''کہ میں نے تم کو ایک ایسے شخص کے حوالے کیا ہے جو تم کو اچھی تربیت دے گا۔ اور ادب سکھائے گا''۔

قریش کے خاندان سعیدی کے حضرت عبداللہ بن سعید اموی رضی اللہ عنہما

(1) نقوش رسول نمبر جلد پنجم ص۔713۔

اسلام لائے تو رسول کریم ﷺ نے ان کو مدینہ کے مسلمانوں کے لیے معلّم مقرر کیا تا کہ وہ ان کو قرآن حکیم اور لکھنے پڑھنے کی تعلیم دیں۔ عہد نبوی ﷺ میں قرآن حکیم کو جمع کرنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم (اجماع القرآن) کے بارے میں محمد بن حبیب بغدادی رضی اللہ عنہما نے ایک علیحدہ اور مکمل فصل باندھی ہے جس میں انہوں نے چھ اصحاب کو جامع اور حافظ قرآن بتایا ہے۔ان کے اسمائے گرامی یہ تھے۔

(1) حضرت سعد بن عبید رضی اللہ عنہما بنو عمرو بن عوف اوس

(2) الوالدراء عویمرین زید رضی اللہ عنہما بنو عدی بن کعب رخزرج

(3) معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما بنو جشم رخزرج

(4) ثابت بن زید رضی اللہ عنہما، بنو ثعلبہ بن کعب رخزرج

(5) ابی بن کعب رضی اللہ عنہما......

(6) زید بن ثابت رضی اللہ عنہ۔ بنو مالک بن نجار رخزرج (1)

اس طرح آپ ﷺ نے اپنی موجودگی میں بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہما سے دینی امور اور مذہبی مسائل پر فیصلے کرائے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس عہد مبارک میں تین اصول پوری طرح ظہور و عمل میں آ چکے تھے۔ اول یہ کہ معاملات زیر بحث کو قرآن حکیم کی روشنی میں حل کیا جائے۔ اور جہاں کوئی ہدایت نہ مل سکے تو سنت کی روشنی میں فیصلہ کیا جائے لیکن ان دونوں سے بھی اگر کسی

(1) نقوش رسول نمبر جلد پنجم ص۔710۔

خاص معاملہ پر روشنی نہ پڑتی ہو تو اس ''رائے'' اور خیال'' پر اعتماد کیا جائے جو کتاب دسنت کا زایدہ و بالیدہ ہے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما کا واقعہ تنہا نہیں ہے بلکہ وہ نمائندگی کرتا ہے اس امر واقعی کی کہ تمام مرکزی تنظیمس اور ان کے ماتحت عالم کارکنان مذہبی و دینی معاملات کی تعبیر و تشریح کرنے کی نہ صرف پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ بلکہ عملاً انہوں ایسا کیا بھی تھا۔ اگر کسی معاملہ پر ان کو پورا شرح صدر نہیں ہوتا تھا۔ تو وہ رسول اکرم ﷺ سے رجوع کر لیتے تھے۔ کہ آپ ﷺ ہی شارح اوّل و مفتی اعظم تھے۔ بہر حال آپ ﷺ کے بعد عموماً صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنی ذاتی رائے اور خیال پر اعتماد کرتے تھے۔ بہر حال ابن سعد نے اپنی مختلف روائتیوں میں عہد نبوی ﷺ کے مدینہ منورہ کے کم از کم آٹھ صحابہ کرام کو مفتیاں وقت میں شمار کیا ہے۔ ان میں پانچ کا تعلق مہاجرین قریش سے تھا۔ اور باقی تین کا انصار کے قبیلہ خزرج سے ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

(1) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ۔

(2) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ۔

(3) حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہما۔

(4) حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما۔

(5) حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہما۔

(6) حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما۔

(7) حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ۔

(8) حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ۔(1)

مقامی نوعیت کی ان درس گاہوں کے علاوہ اسلامی تعلیمات کی تدریس کا ایک طریق کار تبلیغی بھی تھا۔ مختلف قبائل عرب کی دعوت پر بعض اوقات سفیر اور بعض اوقات وفود بھیجے جاتے تھے۔ "مدینہ منورہ میں آ کر اسلام نے امن وامان کی سانس لی تو آنحضرت ﷺ نے نومسلموں کی تعلیم کے لیے جو اطراف مکہ سے دارالسلام آتے تھے نیز ملک کے مختلف گوشوں سے اسلام کی تبلیغ کے لیے ایک جماعت قائم کی۔ جس کا نام عام طور پر اصحاب صفہ مشہور ہے۔ اس میں بعض اوقات سو 100 سے زیادہ آدمی داخل رہتے یہ لوگ ملک میں اسلام کی دعوت کے لیے بھیجے جاتے تھے جو نو مسلموں کو تعلیم دیتے تھے۔ واقع رجیع میں جو ستر صحابہ داعی اور مبلغ راہ میں بیدردانہ قتل ہوئے تھے وہ اسی جماعت کے ارکان تھے۔"(2) یہی وجہ ہے کہ شروع شروع میں تبلیغی طریق کار میں مسلمانوں کو بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ قبائل عرب دعوت تبلیغ دے کر دھوکے سے مسلمانوں کو قتل کر دیتے تھے۔ اس سلسلے میں کئی جانکاہ واقعات پیش آئے۔ جس میں بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم نے جام شہادت نوش کیا۔

(1) نقوش رسول نمبر جلد پنجم ص۔715۔

(2) سیرت النبی جلد چہارم ص۔371۔

"واقعہ رجیع میں ستر 70 صحابہ رضی اللہ عنہم کا مارا جانا واقعہ بیر معونہ میں چھ یا دس داعی مسلمانوں کا قتل ہونا۔ سریہ ابن ابی العوجا میں پچاس مسلمانوں کی شہادت کا واقعہ ذات الطلاح میں چودہ داعی صحابہ رضی اللہ عنہم کا تیروں سے مارا جانا۔ عروہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ کا تیروں سے چھد جانا۔ اس دعویٰ کی شہادت ہے۔" (1)

تعلیم و تبلیغ کے اس مہنگے طریق کار کے باوجود آنحضرت ﷺ نے یہ سلسلہ جاری رکھا۔ حتیٰ کہ قبائل عرب پر اسلام کی دھاک بیٹھ گئی۔ اور ان مبلغین اسلام نے وقتاً فوقتاً چار دانگ عرب میں پھیل کر اسلام کی دعوت کو پھیلایا۔ جس کے نتیجہ میں تمام عرب میں اسلام کا ڈنکا بجنے لگا۔ اصحاب صفہ رضی اللہ عنہم کے علاوہ وہ اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم جو وقتاً فوقتاً مختلف ملکوں۔ بادشاہوں۔ قوموں اور قبیلوں میں اسلام کی دعوت لے کر پھیلے احادیث و سیر کی کتابوں میں انکے نام متفرق طور پر ملتے ہیں۔ سید سلیمان ندوی نے تھوڑی کوشش سے اس قسم کے پینتیس صحابیوں رضی اللہ عنہ کے نام جمع کیے ہیں۔ جنھوں نے از خود آنحضرت ﷺ کے حکم سے اس فرض کو انجام دیا۔ ان کے نام یہ ہیں:

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہما۔ حضرت طفیل بن عمرو دوسی رضی اللہ عنہما۔ حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہما۔ حضرت عمرو بن سلمی رضی اللہ عنہما۔ ضماد بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ۔ حضرت خالد

(1) سیرت النبی ﷺ جلد چہارم ص370۔

بن ولید رضی اللہ عنہما۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما۔ حضرت مہاجر بن امیہ رضی اللہ عنہما۔ حضرت زیاد بن لبید رضی اللہ عنہما۔ حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہما۔ حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہما۔ حضرت علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہما۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما۔ جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہما۔ دحیہ الکلبی رضی اللہ عنہ۔ عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہما۔ جعفر بن شعبہ رضی اللہ عنہما۔ عمر بن العاص رضی اللہ عنہما۔ ولبر بن تحنیس رضی اللہ عنہما۔ عروہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہما۔ عامر بن شہر رضی اللہ عنہما۔ منقذ بن حبان رضی اللہ عنہما۔ ثمامہ بن آثال رضی اللہ عنہما۔ محیصہ بن مسعود رضی اللہ عنہما۔ احنف ابو زید انصاری رحمۃ اللہ علیہ۔ عمرو بن مرہ رضی اللہ عنہما۔ عیاش بن ربیع مخزومی رضی اللہ عنہما۔ واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہما۔ عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہما۔ حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہما۔ سلیط بن عمر بن عبد شمس رضی اللہ عنہما۔ اور شجاع بن وہب اسدی رضی اللہ عنہما۔

ان ہی مبلغوں۔ داعیوں اور قاصدوں کی پکار تھی کہ جس نے یمن۔ بحرین۔ حجاز نجد غرض پورے عرب کو بیدار رکھا۔ اور عرب کے باہر ایران۔ شام۔ مصر۔ اور حبش ہر جگہ اسلام کا پیغام پہنچ گیا۔(1)

(1) سیرت النبی ﷺ جلد چہارم ص 72-371۔

طریقہ ہائے تعلیم

تعلیم و تدریس کے عمل میں طریق تعلیم کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔ کسی علم کی تعلیم دیتے وقت متبدیوں کو مؤثر انداز میں ذہن نشین کرانے کے لیے جو سٹریٹیجی (STRATEGY) اپنائی جاتی ہے اس کو طریقۂ تعلیم کہتے ہیں۔ ہر علم کی نوعیت الگ ہوتی ہے۔ اس لیے اس کی تدریس بھی انہی خطوط پر کی جاتی ہے۔ جس سے متعلم کو سمجھنے میں آسانی ہو یہی وجہ ہے کہ مختلف مضامین کی تدریس میں مختلف طریقہ ہائے تدریس عمل میں لائے جاتے ہیں۔ تاہم انسانی میلانات اور رجحانات کو مدنظر رکھنا کسی بھی طریقۂ تعیم میں نہ صرف سودمند ہوتا ہے۔ بلکہ ضروری بھی۔ جہاں تک حضور اکرم ﷺ کے پیغام اور آپ ﷺ کی تعلیمات کا تعلق ہے ان کی نوعیت ہمہ گیر ہے۔ اس لیے جس موقع پر اور جس انداز میں ضرورت محسوس ہوئی آپ ﷺ نے اسلام کی تعلیمات کو مسلمانوں کے ذہن نشین کرانے کی کامیاب کوشش فرمائی۔ اس سلسلے میں آپ ﷺ نے انسانی نفسیات کو مدنظر رکھ کر جو طریق کار اپنایا۔ اس کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ لہذا طریقہ ہائے تعلیم کے ذکر سے پہلے تعلیم و تدریس کے نفسیاتی پہلو پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس

کے بعد تعلیم و تدریس کے مروجہ طریقہ ہائے تعلیم کی روشنی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانحی مطالعہ سے اخذ کردہ طریقہ ہائے تدریس کا تفصیلی ذکر ہوگا۔

(1) تعلیم کا نفسیاتی پہلو:

تعلیم و تربیت کے فن میں انسان کے فطری میلانات روّیوں اور احساسات کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ آج کل تو یہ علم ایک سائنس کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ تعلیمی نفسیات جس کے بغیر تعلیم و تدریس کے عمل میں خاطر خواہ فواید حاصل ہونے مشکل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تربیت اساتذہ کے دوران اس کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے۔ تاکہ ہر معلّم اپنی پیشہ وارانہ زندگی میں اس سے رہنمائی حاصل کرکے اپنے کام کو بہتر طور پر انجام دے سکے۔

تعلیمی نفسیات کو ہم موجودہ ترقی یافتہ دور میں دریافت شدہ ایک علم قرار دیتے ہیں۔ لیکن ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ آج سے چودہ سو 1400 سال پہلے معلّم اعظم علیہ السلام سے یہ پہلو کسی قدر مخفی نہ تھا۔ کہ تعلیم دیتے وقت مبتدیوں کی ذہنی استعداد کو ملحوظ خاطر رکھنا کس قدر ضروری ہے۔ اس امر کی تصدیق عربی کے اس مشہور مقولے سے بھی ہوتی ہے۔ کَلِّمُوْ النَّاسَ عَلٰی قَدْرِ عَقُوْلِھِمْ (لوگوں سے ان کی عقلوں کے مطابق بات کرو) انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ کہ خوبصورت آسان اور خوش کن بات کو پسند کیا جاتا ہے۔ اس لیے معلّم کا فرض ہے کہ وہ اپنے مُبتدی کی عمر۔ ضروریات۔ مزاج۔ انفرادی

(1) فن تعلیم و تربیت ص 87۔

خصوصیات اور نفسی کیفیات کے مطابق تعلیم دے۔ تعلیم و تربیت میں طلباء کو آسانی بہم پہنچانا۔ شداید اور مشکلات سے بچانا۔ بد دلی اور مایوسی سے دور رکھنا۔ وغیرہ۔ جیسے نفسیاتی تقاضے معلّم کے پیش نظر رہنے چاہئیں۔ اس ضمن میں حضور اکرم ﷺ کا یہ ارشاد کتنے واضح الفاظ میں اس امر کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ لِیَسِّرُوْ وَلَاتُعَسِّرُوْا وَبَشِّرُوا وَلَا تُنَفِّرُوا (1) (آسانیاں بہم پہنچاؤ۔ شدائد میں مبتلا نہ کرو۔ خوشخبری دو۔ متنفر نہ کرو) اس قول کی روشنی میں واضح ہوا کہ آپ ﷺ انسان کے فطری تقاضوں سے بخوبی آگاہ تھے اور ان تقاضوں کو مدنظر رکھ کر تعلیم دیتے تھے۔ جیسا کہ اقتباس ذیل سے ظاہر ہے۔ ''پند و نصائح کتنے ہی مؤثر طریقے سے بیان کئے جائیں لیکن ہمیشہ سنتے سنتے انسان اکتا جاتا ہے۔ اور نصائح بے اثر ہوتے اس بنا پر آپ ﷺ وعظ و نصائح کی مجالس ناغہ دے کر فرمایا کرتے تھے۔ بخاری شریف میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ ہم لوگوں کو ناغہ دے کر نصیحت فرماتے تھے۔ تاکہ ہم لوگ اکتا نہ جائیں۔'' (2)

کتاب الخراج میں امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

''دلوں کی کچھ خواہش اور میلانات ہوتے ہیں۔ اور کسی وقت وہ بات

(1) فیوض الباری شرح صحیح بخاری ص 251۔
(2) سیرت النبی جلد دوم ص 230۔

سننے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ اور کسی وقت اس کے لیے تیار نہیں رہتے۔ تو لوگوں کے اندر ان میلانات کے اندر سے داخل ہو۔ اور اس وقت اپنی بات کہو جب وہ سننے کے لیے تیار ہوں۔ اس لیے کہ دل کا حال یہ ہے۔ کہ جب اس کو کسی بات پر مجبور کیا جاتا ہے تو وہ اندھا ہو جاتا ہے۔" (بات قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے) (1)

علم نفسیات کی اصطلاح میں اس کیفیت کو آمادگی (READINESS) کہتے ہیں جو تعلیم کا نہایت اہم ذریعہ ہے۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اللہ ذہنی آمادگی کا کس قدر خیال رکھتے تھے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت اس سلسلے کی بہترین مثال ہے۔

"امن کے زمانہ میں مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں جو مجالس مقدسہ منعقد ہوا کرتی تھیں ان کے علاوہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم وقت حالات اور ماحول کے مطابق اپنے انداز تعلیم اور طرز خطابت کو بدلتے رہتے تھے۔ خطبات میں حالات متعلقہ کے تطابق کے مظاہر کا بروئے کار لانا بھی اس دلیل سے مؤثر قرار پایا ہے کہ نفس کی خارجی صورت ارتقائیہ ماحول نفس ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کے میدان میں کمان سے ٹیک لگائے ہوئے اور مسجد میں عصا بدست علیٰ ہذا مطابق زمین پر اور ممبر پر خطبہ دیتے ہیں۔" (2)

(1) بحوالہ فن تعلیم و تربیت ص 88۔

(2) سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک محققانہ نظر جلد دوم ص 431۔

نفسیات انسانی اور فطری تقاضوں کا آپ ﷺ کو کس قدر احساس تھا۔ جس کا اندازہ حسب ذیل اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے۔ ''آپ ﷺ بوقت ضرورت طویل خطبات بھی دیتے ہیں۔ لیکن عام طور پر آپ ﷺ کے خطبات اور خطبات جمعہ اس دلیل سے مختصر ہوتے تھے کہ حالات رونده میں ضرورت خاصہ کے واقع نہ ہونے کی وجہ سے اختصار خطاب مطابق حالات ہے۔ نیز آپ ﷺ صبح کی نماز کے بعد خطبہ فرماتے کیونکہ صبح کی نماز کے بعد اعضائے قبول اوّل شعوری و عملی سے کسی حد تک فارغ کی وجہ سے تمکین قبول مضمون کے لیے زیادہ مستعد ہوتے ہیں۔(1)

(2) بات چیت کا طریقہ:

یہ طریقۂ تعلیم معتبر سادہ اور فطری ہے اس کے لیے کسی تکلّف اور اہتمام کی ضرورت نہیں۔ اسلامی تعلیمات کا بیش بہا خزانہ جو آج ہم تک پہنچا ہے۔ وہ اسی طریقہ سے پہنچا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ ﷺ کی مجالس اور صحبتوں میں بیٹھ کر عقائد، شریعت اور اخلاق کی تعلیم اس طریقہ سے سیکھتے تھے اور پھر جا کر دوسروں کو سکھاتے تھے۔ آپ ﷺ باتوں باتوں میں بہت سی ضروری معلومات بہم پہنچا دیتے تھے۔ ان مجالس میں مقامی اور باہر سے آنے والے لوگ شامل ہوتے تھے۔ جیسا کہ اقتباس ذیل سے ظاہر ہے۔

''تعلیم و ارشاد کے مختلف طریقے تھے۔ ایک یہ کہ صحابہ رضی اللہ عنہم دس

(2) سیرت النبی ﷺ پر ایک محققانہ نظر جلد دوم ص 431۔

بیس روز یا مہینہ دو مہینہ عقائد و فقہ کے ضروری مسائل سیکھ لیتے تھے۔ اور قبائل میں واپس جاتے اور ان کو تعلیم دیتے تھے۔ مثلاً مالک بن الحویرث رضی اللہ عنہ جب سفارت لے کر آئے تو بیس دن قیام کیا اور مسائل کی تعلیم حاصل کی۔ دوسرا مستقل طریقہ درس کا تھا۔ یعنی لوگ مستقل طریقہ سے مدینہ میں رہتے تھے۔ اور عقائد و شریعت اور اخلاق کی تعلیم پاتے تھے۔ ان کے لیے صفہ خاص درسگاہ تھی۔ اور اس میں زیادہ وہ لوگ قیامت کرتے تھے۔ جو تمام دنیاوی تعلقات سے آزاد ہو کر شب و روز زہد و عبادت اور زیادہ تر خدمت علم میں مصروف رہتے تھے۔"(1)

اسلام کی روز افزوں ترقی کے پیش نظر مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ اور سب لوگوں کے لیے ممکن نہ رہا کہ وہ بیک وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات عالیہ سے مستفید ہو سکیں۔ تاہم اکثر اوقات آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے مواقع بہم پہنچاتے تھے۔ جن سے کثیر تعداد فیضیاب ہو سکے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلقین و تعلیم کا فیض اگرچہ سفر، حضر، خلوت نشست و برخاست غرض ہر وقت جاری رہتا تھا۔ تاہم اس سے وہی لوگ مستفید ہو سکتے تھے جو اتفاق سے موقع پر ہوتے تھے۔ اس بنا پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم و ارشاد کے لیے بعض اوقات خاص کر دیئے تھے کہ لوگ پہلے سے مطلع رہیں بالخصوص زمانہ

(1) سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم جلد دوم ص 89۔

امن میں تلقین وارشاد کا اہتمام مسجد نبوی ﷺ میں ہوتا تھا۔ جو ہر لحاظ سے ریاست اسلام کا صدر دفتر تھا۔ دوسرے ملکی اور سیاسی امور سے قطع نظر تعلیم و تدریس کی یہ صحبتیں عموماً مسجد نبوی ﷺ میں منعقد ہوتی تھیں۔ مسجد نبوی ﷺ میں ایک چھوٹا سا صحن تھا۔ کبھی آپ ﷺ وہاں نشست فرماتے۔ ابتداً آنحضرت ﷺ کی نشست کے لیے کوئی جگہ مخصوص نہ تھی۔ باہر سے اجنبی لوگ آتے تو آپ ﷺ کے پہچاننے میں دقت ہوتی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے مٹی کا ایک چھوٹا سا چبوترہ بنا دیا تھا۔ آپ ﷺ اس پر تشریف رکھتے۔ باقی دونوں طرف صحابہ رضی اللہ عنہم حلقہ باندھ کر بیٹھ جاتے۔(1)

گزشتہ اقتباسات میں تعلیم و ارشاد کی جن مجالس کا ذکر ہوا ہے۔ ان میں عمومی طریقۂ کار یہی بات چیت کا طریقہ تھا۔ تاہم بعض اوقات دوسرے طریقے بھی عمل میں لائے جاتے تھے۔ جن کا ذکر بعد میں آئے گا۔

(3) خطابت یا تقریری طریقہ:

(LECTURE METHOD) فن تعلیم کے تاریخی مطالعہ سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ طریقہ ہائے تدریس میں قدیم ترین تقریری طریقہ ہے۔ جو آج بھی مستعمل ہے۔ اس کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس ترقی یافتہ دور میں جہاں METHODOLOGY OF TEACHING نے حیرت انگیز حد تک ترقی

(1) سیرت النبی ﷺ جلد دوم ص 227۔

کی ہے۔ آج بھی اعلیٰ درس گاہوں میں متعین افراد کو خطیب یا لیکچرار کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اگر چہ وہ فنِ تدریس میں دوسرے طریقوں کو بھی استعمال میں لاتے ہیں تاہم اس کا اس طریقۂ تدریس کے ساتھ موسوم ہونا اس کی قدامت اور فنِ تعلیم میں اس کی نمایاں حیثیت کا بیّن ثبوت ہے۔

اس سے قبل کہ ہم اس طریقۂ تدریس کے حوالے سے نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات کا جائزہ لیں۔ ایک بات پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ کہ فطرت کاملہ نے لیڈر شپ یا قیادت کے عناصر ترکیبی میں جو صلاحیتیں رکھی ہیں ان میں خطابت کا عنصر نمایاں ہے۔ دوسرے الفاظ میں کسی نوع کی قیادت کے لیے بہترین مقرر ہونا ضروری ہے، اپنے دعویٰ کے لحاظ سے خواہ وہ سیاسی لیڈر ہو۔ روحانی قائد ہو یا خدا کا فرستادہ رسول ہو۔ اس اصول کے پیشِ نظر خداوند کریم نے ہر نبی اور رسول کو اس صفت سے متصف کیا ہے کیونکہ جب تک کسی دعوت کو اچھے پیرائے میں لوگوں کے سامنے پیش نہ کیا جائے تو وہ اس کی اہمیت اور افادیت کو کیونکر سمجھ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کی پرورش اس ماحول میں فرمائی جو ہر لحاظ سے فصاحت و بلاغت کا سرچشمہ تھا۔ آنحضرت ﷺ نے خوش بیان اور شیریں زبان قبائل میں پرورش پائی۔ آپ ﷺ بنو ہاشم میں پیدا ہوئے۔ قریش میں بڑھے۔ بنو سعد میں دودھ پیا۔ لہٰذا قدرتی طور پر آپ ﷺ تمام عربوں سے فصیح ہو گئے۔ خود آپ ﷺ نے اپنے متعلق ایک دفعہ سب سے زیادہ فصیح ہونے کا

دعویٰ فرمایا۔ (1)انا اعربکم انا من قریش ولسانی لسان بنی سعد ابن ابی بکر۔ (میں تم میں سے فصیح تر ہوں۔قریشی ہوں۔اور میری زبان بنو سعد بن بکر کی زبان ہے)(2)

اسی طرح دوسرے ارشادات گرمی اس نوع کے ہیں۔

انا افصح العرب (میں عرب میں سے فصیح تر ہوں)اور

بعثت بجوامع الکم (میں جوامع الکلم کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہوں)اس میں بھی اسی فصاحت وجامعیت مؤثر کی وضاحت ہے۔(3)

خطابت یا تقریری طریقہ تدریس کی کامیابی کا انحصار سراسر فصاحت و بلاغت پر ہے۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس صفت سے بدرجۂ اتم متصف تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت ایک داعی مذہب کی تھی اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو زندگی کے جملہ امور کی تعلیم وتلقین کرنا مقصود تھی اس اہم ذمہ داری کے پیش نظر خطابت کا طریقہ موزوں تھا۔جس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے موقع اور محل کے مطابق استعمال کیا۔بُعثت سے لے کر حجۃ الوداع تک ہر آن یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس مدت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مختلف حیثیتیں تھیں۔اور اس کا اثر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز بیان پر بھی پڑتا تھا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم داعی مذہب تھے۔فاتح تھے۔واعظ تھے۔امیر الجیش تھے۔قاضی تھے۔اور پیغمبر تھے۔اس اختلاف حیثیت نے

(1) تاریخ ادب عربی ص202-203۔
(2) سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک محققانہ نظر ص430-431۔
(3) سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک محققانہ نظر ص431۔

آپ ﷺ کی خطابت اور زور بیان میں نہایت اختلاف پیدا کر دیا تھا۔ بلاغت کا اقتضاء بھی یہی ہے۔ آپ ﷺ بحیثیت داعئ مذہب ہونے کے جو خطبہ دیتے تھے۔ اس میں زور اور جوش پیدا ہوتا تھا۔ اور اس وقت آپ ﷺ کی حیثیت بالکل ایک امیر الجیش کی ہوتی تھی۔(1)

ان جملہ حیثیتوں کے پیش نظر اپنے مقصد کی تکمیل میں جو تبدیلی طرز بیان اور طریقۂ تقریر میں موجود تھی وہ بالکل وقتی تقاضوں کے عین مطابق تھی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ایک معلّم کی حیثیت سے اس طریقۂ تدریس کا استعمال کس انداز میں ہوا۔ ''ان حیثیتوں کے علاوہ آپ ﷺ کی حیثیت ایک معلّم اور ایک واعظ کی تھی۔ آپ ﷺ نے اس حیثیت میں جو خطبے دیئے ہیں۔ وہ اگرچہ سادہ ہیں۔ تاہم ان میں بھی معمولی بلاغت کا اسلوب موجود ہے۔ ایک اخلاقی واعظ کے لیے پیچ دار ترکیب۔ شاندار الفاظ۔ اور تشبیہہ و استعارہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کو صرف سادہ الفاظ۔ واضح جملے اور مختلف ترکیبوں سے مطالب کو ذہن نشین کرانا پڑتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اس حیثیت سے جو خطبے دیئے ہیں۔ وہ تمام تر اسی قسم کے ہیں۔(2)

فن تقریر یا خطابت میں سامعین کی دلچسپی اور آمادگی کے لیے برمحل واقعات تیکھی تشبیہات اور شستہ تمثیلات کا استعمال نہایت موزوں ہوتا ہے۔

---

(1) سیرت النبی ﷺ جلد دوم ص 237۔

(2) سیرت النبی ﷺ جلد دوم ص 242۔

تاہم آپ ﷺ کے کلام کی اصل خوبی مختصر اور سادہ الفاظ میں وہ جامعیت ہے۔ جو اپنی اثر انگیزی کے لحاظ سے معجزاتی اثرات کی حامل تھی۔ اس ضمن میں جنگ حنین کے بعد مال غنیمت کی تقسیم میں نومسلموں کو ترجیح دینے پر انصار میں اضطراب کی کیفیت کو دیکھ کر آپ ﷺ کا یہ ارشاد فرمانا کہ کیا تمہیں یہ بات پسند نہیں کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے کر جائیں اور تم اللہ کے رسول ﷺ کو ساتھ لے کر گھر کو لوٹو۔'' ان چند سادہ الفاظ سے انصار نہ صرف ''یا رسول اللہ قد رضینا(2) (اے اللہ کے رسول ہم اس تقسیم پر راضی ہیں)'' پکار اٹھے بلکہ انہیں اپنی اس غلطی کا اس قدر احساس ہوا کہ وہ رونے لگے۔

جامعیت کی دوسری مثال حجۃ الوداع کا وہ خطبہ ہے جو زندگی کے جملہ پہلوؤں پر اس قدر محیط ہے کہ اسے انسانی زندگی کا ''چارٹر'' کہنا بے محل نہ ہوگا۔

''تمہارے خون اور تمہارے مال ایک دوسرے پر اس طرح حرام ہیں جس طرح یہ آج کا دن۔ اور یہ شہر مکہ حرام ہے۔ جاہلیت کے تمام رسوم میرے قدموں کے نیچے ہیں۔ جاہلیت کے تمام خون اور سود معاف ہیں سب سے پہلے میں ابن ربیعہ کا خون اور عباس رضی اللہ عنہ کا سود معاف کرتا ہوں۔ ان عورتوں کے بارے میں جو تمہارے نکاح میں ہیں۔ اللہ سے ڈرتے رہو۔

(1) ماہنامہ ''محدث'' ربیع الاول 1397ھ ص35۔

ان پر تمہارا حق ہے، کہ وہ جن لوگوں کو تم ناپسند کرتے ہو اپنے گھر میں گھسنے نہ دیں۔ اگر وہ ایسا کریں تو انہیں ہلکی ہلکی مار مارو۔ اور تم پر ان کا حق یہ ہے کہ تم ان کی خوراک اور لباس کی ذمہ داری اٹھاؤ۔ میں تم میں ایک ایسی چیز چھوڑے جا رہا ہوں اگر اسے مضبوطی سے تھام رکھو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ اور وہ ہے اللہ کی کتاب۔ قرآن مجید" (1)

معلّم کی تدریس واعظ کے خطاب اور قائد کی تقریر کے نتائج کا تجزیہ طالبعلموں سامعین اور پیروکاروں کے طرزِ عمل سے ہوتا ہے۔ اگر طرزِ عمل میں تبدیلی فوری نوعیت کی ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ خطاب یا تقریر نے اپنا اثر پیدا کیا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے آپ ﷺ کی تعلیمات کی اثر انگیزی کو جانچنے کے لیے اسلامی انقلاب کی وہ ارتقائی تاریخ شاہد ہے جس نے نہایت قلیل مدت میں عرب جیسے جہالت کدہ کو علم و عرفان کا گہوارہ بنا دیا۔ تاہم آپ ﷺ کی خطابت کی اثر انگیزی کی ایک دو مثالیں پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

ضماد بن ثعلبہ جو نبواز وشوہ کے رئیس تھے اور زمانہ جاہلیت میں آپ ﷺ کے دوست تھے۔ انہوں نے سنا کہ محمد ﷺ کو جنون ہو گیا ہے تو حاضر ہوئے اور کہا لاؤ میں تمہارا علاج کر دوں تو آپ ﷺ نے فرمایا

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَامُضِلَّ لَہٗ

(1) سیرت النبی ﷺ جلد دوم ص 242۔

وَمَنْ يُضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗo

یہ سن کر ضماد بہت متاثر ہوئے تین بار پڑھوایا تا آنکہ اسی وقت دست مبارک پر بیعت کی۔ پھر فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعمیل میں اپنے تمام قبیلے کی طرف سے بیعت کی اور تمام قبیلہ ان کی دعوت پر مسلمان ہو گیا۔'' (1)

ایک مرتبہ ایک قبیلہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات کے لیے آیا گفتگو ہوئی تو قبیلہ کے افراد بے اختیار پکار اٹھے۔ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم جس سرزمین پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے ہم نے بھی وہیں جنم لیا۔ جن گلی کوچوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پرورش پائی وہیں ہم بھی پروان چڑھے۔ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان ہے وہ ہماری زبان بھی ہے۔ لیکن ہماری بات میں وہ بات نہیں۔ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات میں ہے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا۔ اِنَّ اللّٰہ عَزَّوَجَلَ اَدَبِیْ میری تربیت خالق کائنات نے خود کی ہے۔ اور مجھے بولنے کا انداز اس نے خود سکھایا ہے۔ (2)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر وعظ نہایت ہی موثر ہوتا تھا۔ کہ سامعین کی آنکھوں میں آنسو جاری ہو جاتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریر خشک نہ ہوتی بلکہ اپنے اندر کشش اور دلچسپی کا پورا سامان رکھتی۔ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریر سنتا مزید سننے کی اسے تمنا رہتی۔ سامعین پر بیخودی اور وارفتگی کا عالم طاری ہوتا۔ کہ بے

(1) سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک محققانہ نظر 32-431۔

(2) ماہنامہ ''محدث'' ص 30۔

اختیار پکار اٹھتے۔''اے اللہ کے رسول ﷺ آپ ﷺ جس انداز سے وعظ فرماتے ہیں ہمیں گمان گزرتا ہے کہ شاید یہ آپ ﷺ کا آخری وعظ ہے۔ لہٰذا ہمیں اور سنایئے۔(1)

وعظ وتلقین کی مجالس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر آپ ﷺ کے ارشادات کا جو اثر ہوتا تھا۔ کتب سیر اور احادیث میں اس کے کئی واقعات موجود ہیں۔ بڑے بڑے مجمعوں میں آپ ﷺ نے جو تقاریر فرمائیں۔ان میں غزوۂ حنین کے بعد انصار کے سامنے اور حجۃ الوداع کے موقع پر آخری خطبہ اپنی اثر انگیزی کے لحاظ سے مثالی کہے جاسکتے ہیں۔اس کی علاوہ روزمرہ مجالس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جو کیفیت ہوتی تھی وہ اس واقعہ سے ظاہر ہے۔

''ایک دفعہ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ خدمت اقدس ﷺ میں آئے اور کہا یا رسول اللہ ﷺ میں منافق ہوگیا ہوں۔ میں جب خدمت اقدس میں حاضر ہوتا ہوں اور آپ ﷺ دوزخ اور جنت کا ذکر فرماتے ہیں تو یہ چیزیں آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں۔لیکن بال بچوں میں آکر سب بھول جاتا ہوں۔ارشاد ہوا کہ اگر باہر نکل کر بھی وہی حالت رہتی تو فرشتے تم سے مصافحہ کرتے۔''(2)

بعثت نبوی ﷺ کے وقت عرب اخلاقی اور روحانی انحطاط کا شکار تھے۔ لیکن ساتھ ہی عربی زبان کو اس عہد میں ایک حیرت انگیز ارتقاء نصیب ہوا تھا۔(جس کا ذکر علیحدہ باب میں آئے گا) جس کے پیش نظر عربی زبان

(1) ماہنامہ''محدث''ص 31۔

(2) سیرت النبی ﷺ جلد دوم ص 234

نہایت فصیح و بلیغ زبان بن گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ عرب فصاحت و بلاغت کے دلدادہ تھے۔ ایسے ماحول میں فن خطابت کا معیار بہت بلند تھا۔ بحیثیت واعظ اور خطیب آپ ﷺ اس معیار پر پورے اترے۔ آپ ﷺ کا کلام جن صفات کا حامل تھا اس کا اندازہ حسب ذیل اقتباس سے ہوتا ہے۔

آپ ﷺ کا کلام بقول جاحظ "ایسا کلام تھا جس کے حروف کی تعداد کم اور معنی کی تعداد زیادہ تھی۔ جو صنعت و آورد سے بالاتر اور تکلّف سے منزّہ ہوتا تھا۔ اس میں تفصیل کی جگہ تفصیل اور اجمال کی جگہ اجمال تھا۔ وہ بے قاعدہ۔ غریب و وحشی الفاظ سے خالی نیز بازاری اور عامیانہ الفاظ سے پاک تھا۔ الغرض لوگوں نے آپ ﷺ کے کلام سے زیادہ مفید۔ سچا۔ مناسب و موزوں خوش اسلوب و خوش معانی۔ پر اثر و دلنشین۔ آسان و زود رفہم اور اپنے مطالب کو کھول کر بوضاحت بیان کرے میں کوئی کلام ایسا نہیں سنا۔" (1)

(4) سوال و جواب کا طریقہ:

ہم آپ ﷺ کی سیرت مطہرہ اور حیات طیبہ سے تدریس کا جو چوتھا طریقہ اخذ کر پائے ہیں۔ وہ سوال و جواب کا طریقہ ہے۔ اس طریقۂ تعلیم کی اہمیت و افادیت تعلیم و تعلّم سے واسطہ رکھنے والے لوگوں سے پوشیدہ نہیں۔ اور یہ موجودہ دور میں بھی خصوصاً معلوماتی مواد ذہن نشین کرانے کے لیے دوسرے طریقوں سے بدرجہا مؤثر ہے۔

(1) تاریخ ادب عربی میں ص 303۔

ہمیں یہ بات کہنے میں کلام نہیں کہ اسلامی تعلیمات کا وافر حصہ اس طریقہ تدریس کی بدولت ہم تک پہنچا۔ اس طریقہ تدریس کے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ ایسے سوالات جو مبتدیوں یا مخالفین کی طرف سے کیے گئے۔ اور ان کا جواب دیا گیا ہو۔ اور دوسرے ایسے سوالات جن کا استفسار خود نبی اکرم ﷺ نے مزید معلومات بہم پہنچانے کے لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کیا ہو۔ اور پھر انکا جواب مرحمت فرمایا ہو۔ بہر حال دونوں پہلو مقصدیت کے لحاظ سے یکساں طور پر مفید ہیں۔ اوّل الذکر کے سلسلے میں قرآن حکیم کی وہ آیات بطور مثال پیش کی جا سکتی ہیں۔ جن کے جواب کے متعلق رسول اکرم ﷺ نے مصلحتاً خاموشی اختیار فرمائی۔ اور اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ان کا براہ راست جواب دیا۔ اور یہ آیات یَسْئَلُوْنَکَ سے شروع ہوتی ہیں۔ جن میں شراب۔ حرام و حلال اور روح وغیرہ کا جواب دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ انسان کی معاشی۔ معاشرتی اور مذہبی زندگی پر محیط وہ ساری معلومات ہیں جو احادیث نبوی ﷺ میں موجود ہیں۔ ان میں قال رسول اللہ ﷺ کے اکثر محرکات میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا معلومات حاصل کرنے کا وہ جذبہ اور ذوق کارفرما ہے جس کے ذریعے آئندہ نسلوں کے لیے دین کے جملہ پہلو اجاگر ہوئے۔ جس کا منطقی نتیجہ یہ ہے۔ کہ آج زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کے متعلق اسلام میں راہنمائی موجود نہ ہوا۔ خدا کروڑ کروڑ رحمتیں فرمائے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر جنہوں نے ہماری راہنمائی کے لیے معلومات فراہم کیں۔

تعلیم وارشاد کے لیے آپ ﷺ اس طریقہ تدریس کی افادیت سے بخوبی آگاہ تھے۔ چنانچہ بہت سی معلومات حضور ﷺ اس طریقے سے ذہن نشین کراتے تھے۔ جو کچھ بتانا ہوتا پہلے اسے سوال کی شکل میں رکھتے پھر صحیح جواب ارشاد فرماتے دوسروں کو بھی آزادی سے سوالات پوچھنے کا موقع دیتے۔ البتہ لغو اور لایعنی سوالات کے لیے یا تو مناسب انداز میں منع فرما دیتے یا صرف نظر کر جاتے۔ غیر متعلق سوال ہوتا تو بات ختم کرنے کے بعد علیحدہ سے جواب ارشاد فرمادیتے۔

معلومات بہم پہنچانے اور مبتدیوں کے تجسس کو تحریک دینے کے لیے بعض دفعہ آپ ﷺ عام معلوماتی سوال کیا کرتے تھے۔ جس کا ایک فائدہ یہ ہوتا تھا کہ مبتدیوں کی تحصیل کا بھی اندازہ ہو جاتا تھا۔ کبھی کبھی آپ ﷺ خود امتحان کے طور پر حاضرین سے کوئی سوال کرتے اس سے لوگوں کی جودت فکر اور اصابت رائے کا اندازہ ہوتا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ ایک دفعہ آپ ﷺ نے پوچھا۔ وہ کون سا درخت ہے جس کے پتے جھڑتے نہیں اور جو مسلمانوں سے مشابہت رکھتا ہے۔ لوگوں کا خیال جنگل کے درختوں کی طرف گیا۔ میرے ذہن میں آیا کہ کھجور کا درخت ہوگا۔ لیکن میں کم سن تھا۔ اس لیے جرأت نہ کرسکا۔ بالآخر لوگوں نے عرض کیا حضور ﷺ بتائیں۔ ارشاد فرمایا کھجور‘‘۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو تمام عمر حسرت رہی کہ کاش میں نے جرأت کر کے اپنا خیال ظاہر کر دیا ہوتا۔ (1)

(1) سیرت النبی ﷺ ص 231 جلد دوم، فیوض الباری شرح صحیح البخاری ص 240-41۔

عورتوں کی تعلیم

قرآن وسنت کی روشنی میں علم کی فضیلت کا پچھلی سطور میں ذکر ہو چکا ہے۔ جس کا اطلاق بلا امتیاز جنس ہر مسلمان مرد اور عورت پر ہوتا ہے۔ جیسا کہ حدیث مذکور سے واضح ہے۔

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَ مُسْلِمَةٌ (مشکوٰۃ)

اس حدیث کی روشنی میں عورتوں کی تعلیم کی اہمیت بالکل واضح ہے۔

اسی طرح قاضی سلیمان منصور پوری نے ایک حدیث نقل کی ہے۔ جس میں بیان کیا گیا ہے کہ جس کسی کے پاس کوئی لونڈی ہو اور وہ اسے تعلیم دے اور اچھی تعلیم دے اور اس کے بعد اسے آزاد کرے۔ پھر اسے بیوی بنائے تو اس شخص کو دو چند اجر ملے گا۔(1)

مسلمان عورتوں کی تعلیم کے متعلق آپ ﷺ کے خصوصی التفات کا یہ قول مظہر ہے۔ کہ آپ ﷺ نے ایک دفعہ فرمایا۔ "عبداللہ مر گیا ہے۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیاں چھوڑ گیا ہے۔ اس لئے میں نے ایک بیوہ سے نکاح کیا تا کہ وہ انہیں علم وادب سکھائے۔(2)

(1) رحمۃ للعالمین جلد اول۔ طبع ششم ص355

(2) عہد رسالت کا نظام تعلیم ص113۔

عہد نبوی ﷺ میں اس امر کا کہاں تک اہتمام کیا گیا؟ اس سلسلے میں یہ کہنا کافی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضور اکرم ﷺ کی روزمرہ زندگی میں اسلامی تعلیمات کا جو سلسلہ رائج تھا۔ اس سے عورتیں بھی برابر بہرہ ور ہو رہی تھیں۔ آپ ﷺ کی مجالس میں اور خصوصاً گھر میں عورتیں خدمت میں حاضر ہو کر غیر رسمی طور پر رشد و ہدایت پاتی تھی۔ عورتوں کے سلسلے میں نبی اکرم ﷺ کا اپنا معمول یہ تھا کہ ہفتے میں ایک دن عورتوں کے خصوصی مجمع میں تشریف لے جاتے اور ان کو تعلیم دیتے اور ان کے سوالات کے جواب دیتے تھے۔(1)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ عورتوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ مردوں نے آپ ﷺ سے (علم و حکمت میں) ہم سے زیادہ حصہ لیا ہے آپ ﷺ ہمارے لیے کوئی دن (تعلیم و تربیت کے لیے) مخصوص و متعین فرما دیں۔ آپ ﷺ نے ایک دن کا وعدہ فرمایا۔ اس میں اپ ﷺ ان سے ملتے ان سے وعظ یعنی تعلیم و تربیت فرماتے اور صدقہ یعنی اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا حکم فرماتے (صحیح بخاری۔ کتاب العلم) اس حدیث میں مسلم خواتین میں علم و حکمت سیکھنے اور اخلاقی تربیت حاصل کرنے کی طلب و جستجو کا پتہ چلتا ہے اس اقتباس کی تائید حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت سے ہوتی ہے وہ فرماتی ہیں کہ انصار کی خواتین بہت اچھی ہیں۔ ''کہ انہیں دینی بصیرت حاصل کرنے میں حیاء مانع نہیں آتی۔''(2)

(1) عہد نبوی ﷺ میں نظام تعلیم ص 18۔
(2) پیغمبر اعظم و آخر۔ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر ص۔ 430۔ (بحوالہ فتح الباری)

انسانی زندگی کے بے شمار مسائل ایسے ہیں جن کا تعلق خصوصی طور پر عورتوں کے ساتھ ہے۔ اسلام ان نسوانی مسائل کے متعلق بھی تفصیلی راہنمائی فراہم کرتا ہے کیونکہ صنف لطیف نصف امت ہے اور اسلام نصف امت کے مسائل کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ جن مسائل کا تعلق عورتوں کی نسوانی زندگی کے ساتھ ہے۔ ان کے متعلق کوئی عورت کسی غیر محرم مرد کے ساتھ گفتگو کرنے سے شرماتی ہے۔ حضور ﷺ عورتوں کے مسائل کے متعلق جو تعلیمات لے کر مبعوث ہوئے تھے ان تعلیمات کو امت کی عورتوں تک پہنچانے، عورتوں کو وہ مسائل سمجھانے اور ان پر عمل کر کے دکھانے کے لیے آپ ﷺ کو ایسی خواتین کی ضرورت تھی جو انتہائی پاکباز، ذہین و فطین، دیانت دار اور متقی ہوتیں اور فریضۂ رسالت کی تبلیغ کے لیے مخلص کارکنوں کی حیثیت سے کام کر سکتیں۔ ان کاموں کے لیے حضور ﷺ کو ایسی خواتین کی ضرورت تھی۔ جو مذہب و معاشرے کی طرف سے کسی قدغن کے بغیر آپ ﷺ کے کاشانۂ اقدس میں آپ ﷺ کے ساتھ رہ سکتیں۔ یہ کام صرف وہی خواتین کر سکتی تھیں۔ جو حضور ﷺ کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوتیں۔ جب اس حقیقت کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ بات سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے کہ حضور ﷺ جب اپنے امتیوں کو باکرہ عورتوں کے ساتھ شادی کرنے کی ترغیب دیتے تھے تو آپ ﷺ نے خود اس پر عمل کیوں نہ کیا۔ حضور ﷺ نے جن مقاصد کے ساتھ شادیاں کی تھیں ان مقاصد کے

لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تجربہ کار اور جہاندیدہ خواتین کی ضرورت تھی۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں خواتین کا انتخاب فرمایا جو اس مقصد کے لیے معاون ثابت ہو سکتی تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا) کے سوا تمام بیوہ خواتین کو اپنی زوجیت میں لیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس ایک باکرہ خاتون کو شرف زوجیت بخشا وہ بھی اپنی صغرسنی کے باوجود مذکورہ صفات میں کسی جہاندیدہ خاتون سے کم نہیں تھیں بلکہ مذکورہ بالا مقاصد کو جس حسن و خوبی کے ساتھ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پورا کیا وہ انہی کا حصہ ہے۔

عورتوں کے مسائل مثلاً حیض، نفاس، جنابت اور امور زوجیت کے مسائل ایسے تھے۔ جو نہ تو عورتیں کھل کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کر سکتی تھیں اور نہ ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کھل کر ان کا جواب دے سکتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں۔ کہ ایک انصاری عورت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے غسل حیض کے متعلق سوال کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل حیض کا طریقہ سمجھایا اور پھر فرمایا۔ ایک خوشبودار روئی کا گالا لو اور اس کے ذریعے طہارت حاصل کرو۔ اس عورت نے عرض کیا روئی کے گالے کے ذریعے کیسے طہارت حاصل کروں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کے ساتھ طہارت حاصل کرو۔ اس نے پھر عرض کیا یارسول اللہ میں اس کے ذریعے کیسے طہارت حاصل کروں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سبحان اللہ اس کے ساتھ طہارت حاصل کرو۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔ میں نے یہ صورت حال دیکھی تو اس عورت کو ہاتھ

سے پکڑا اپنی طرف کھینچا۔ اور اسے بتایا کہ روئی کے گالے کو فلاں مقام پر رکھو اور اس کے ذریعے خون کا اثر ختم کرو۔(1)

تعلیم کا یہ کام اس موقع پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے انجام دیا اور باقی امہات المومنین نے بھی اس انداز میں تعلیم امت کے فریضہ کی ادائیگی میں اپنا اپنا کردار ادا کیا۔ مسلمان عورتوں کا یہ معمول تھا۔ کہ جب ان کو اس قسم کا کوئی مسئلہ پیش آتا تو امہات المومنین میں سے کسی کی خدمت حاضر ہوتیں اور اپنا مسئلہ عرض کرتیں۔ ان کو اگر اس مسئلے کا حل پہلے سے معلوم ہوتا تو ان عورتوں کو بتا دتیں ورنہ حضور ﷺ سے پوچھ کر سائلہ کو اس مسئلے کا حل سمجھا دیتیں۔

ان حقائق کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے۔ کہ حضور ﷺ کی ازواج مطہرات صرف امہات المومنین ہی نہیں بلکہ وہ ملت کی معلّمات بھی ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو آدھا دین حضور ﷺ کی ازواج مطہرات کی وساطت سے ہی ملا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ امت پر ان کے اس احسان کی وجہ سے انہیں ساری امت کی مائیں قرار دیا گیا ہے۔ اس لئے حضور ﷺ کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد ان کے ساتھ کسی دوسرے کے نکاح کو حرام قرار دے دیا گیا ہے۔

(1) ضیاالنبی ﷺ جلد ہفتم۔ ص 481۔

عورتوں کی مخصوص عائلی تعلیم کا ذریعہ امہات المومنین تھیں۔ اور ان میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جن کو رحمت عالم ﷺ سے انتہائی قرب حاصل تھا۔ اس قرب اور اپنی خداداد ذہانت وصلاحیت کی وجہ سے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو فقہ اور دیگر اسلامی علوم نیز ادب۔ شاعری اور طب میں بڑا ملکہ حاصل ہو گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مرتبہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ "آدھا علم عائشہ سے حاصل کرو۔"

علم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مقام نہ صرف امہات المومنین میں بلند ترین تھا۔ بلکہ اکثر صحابہ کرام بھی آپ رضی اللہ عنہ کے بحر علم سے استفادہ کرتے تھے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"ہم اصحاب رسول رضی اللہ عنہم کو جب کبھی کسی حدیث پاک کو سمجھنے میں مشکل پیش آئی اور ہم نے اس کے متعلق حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا تو ان کے پاس اس حدیث کی متعلق علم موجود پایا۔"

حضرت عمروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

"میں نے کسی عورت کو طب، فقہ اور شعر کے علوم میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بڑھ کر نہیں پایا۔"

امام زہری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"اگر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے علم کے مقابلے تمام امہات

المومنین بلکہ تمام عورتوں کے علوم کو رکھا جائے تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے علم کا پلہ بھاری نکلے۔"

حضرت عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

"حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا تمام انسانوں سے زیادہ احکام دین کو سمجھنے والی تھیں اور امور عامہ میں آپ رضی اللہ عنہا کی رائے صائب ترین ہوتی تھی" (1)

گویا اسلام میں آپ رضی اللہ عنہا پہلی معلّمہ تھیں۔ ازواج مطہرات میں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا اور حضرت سلمہ رضی اللہ عنہا لکھنا پڑھنا جانتی تھیں۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے یہ فن خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے شفاء بنت عبداللہ سے سیکھا تھا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا علم قرآن و علم حدیث کے علاوہ فصاحت و بلاغت اور علم عروض میں ماہر تھیں۔ نہایت فصیح و بلیغ تقریر کرتی تھیں۔ اور اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیاں حضرت زینب رضی اللہ عنہا بنت علی رضی اللہ عنہ اور کلثوم رضی اللہ عنہا اور پوتیاں حضرت سکینہ رضی اللہ عنہا اور فاطمہ صغریٰ رضی اللہ عنہا بھی زیور تعلیم سے آراستہ تھیں۔ (2)

مسلمان عورتوں کی تعلیم میں حضرت ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ایک خاص مقام ہے۔ خواتین کی تعلیم کے سلسلے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے کو ایک مدرسے کی حیثیت حاصل تھی۔ لڑکے۔ عورتیں اور جن مردوں کا

(1) ضیاء النبی ﷺ جلد ہفتم ص 495-496۔

(2) مسلم خواتین کی تعلیم۔ محمد امین زبیری ص 11-12۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پردہ نہ تھا۔ وہ حجرہ کے اندر آ کر بیٹھتے تھے۔ اور دوسرے لوگ حجرے کے سامنے مسجد نبوی ﷺ میں بیٹھتے تھے۔ دروازہ پر پردہ پڑا رہتا تھا۔ پردہ کی اوٹ میں وہ خود بیٹھ جاتیں۔ لوگ سوالات کرتے اور آپ رضی اللہ عنہا جوابات دیتیں۔ کبھی کوئی سلسلہ بحث چھڑ تا۔ اور استادشاگرد اس خاص موضوع پر گفتگو کرتے۔ کبھی خود کسی مسئلہ کو چھیڑ کر بیان کرتیں اور لوگ خاموشی سے سنتے کبھی خاندان کے لڑکے اور لڑکیوں اور شہر کے یتیم بچوں کی تعلیم و تربیت کرتیں۔ حج کے موقع پر بھی آپ لوگوں کی تعلیم و تربیت فرماتی تھیں۔ علم کے پیاسے دور دراز ممالک سے آتے اور آپ رضی اللہ عنہا کے حلقہ درس میں شریک ہوتے۔ مسائل دریافت کر کے اپنے شبہات کا ازالہ چاہتے تابعین میں جو علمائے حدیث تھے۔ ان میں اڑتالیس 48 عورتیں تھیں۔ وہ آپ رضی اللہ عنہا ہی کے حلقہ تعلیم و تربیت سے فیض یاب ہوئی تھیں۔ (1)

تعلیم دین کے یہ مدرسے حضور ﷺ کی حیات طیبہ میں بھی اور آپ ﷺ کے انتقال کے بعد علم کا نور پھیلاتے رہے۔ اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی مشکل ترین مسائل کا حل دریافت کرنے کے لیے کسی ام المومنین کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ اور وہاں سے انہیں مشکل ترین سوالات کے جواب مل جاتے تھے۔ اس طرح حضور ﷺ نے تعدد ازواج کے قانون کو ایک ایسا تعلیمی ادارہ قائم کرنے کے لیے استعمال کیا جس میں ماہرین علوم

(1) مسلم خواتین کی تعلیم۔ محمد امین زبیری ص 13۔

اسلامیہ کی ایک جماعت علمی خدمات انجام دینے میں مصروف تھی۔ جو شخص حضور ﷺ کی شادیوں (تعداد ازدواج) کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے اس اہم ترین مقصد کو نظر انداز کر دیتا ہے وہ اس مسئلے کی حقیقت کو کیسے سمجھ سکتا ہے۔(2)

(2) ضیاء النبی جلد ہفتم ص۔482۔

عربی زبان......ذریعۂ تعلیم

کسی بھی نظام تعلیم کے خدوخال کا تعین کرنا اس وقت تک نامکمل ہوگا جب تک کہ ہم ذریعۂ تعلیم یعنی زبان کا ذکر نہیں کریں گے۔ زبان انسانی علوم و معارف کے انتقال و اتصال کا اہم ترین ذریعہ ہے۔ اور اس کے بغیر علوم و فنون کی تدریس ناممکن ہے۔ ایک اچھے نظام تعلیم کے دور رس نتائج اسی صورت میں برآمد ہو سکتے ہیں کہ اسے ایک ترقی یافتہ زبان کی مدد حاصل ہو۔ اسلامی نظام تعلیم کے سلسلے میں عربی زبان کی اہمیت اس لیے بھی واضح ہے کہ یہ قرآن کی زبان ہے۔ اور اسلامی تعلیمات کے جملہ علوم و معارف کا معدن و مخزن ہے۔ اسی زبان کو آفاقی ہدایات کا انسانوں تک پہنچانے کا ذریعہ بنایا گیا۔ چنانچہ اس کی فصاحت و جامعیت کی قرآن مجید نے یوں تصریح فرمائی:

(1) وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ۔ (قمر۔40)

ترجمہ: اور ہم نے سمجھنے کے لیے قرآن کو آسان کر دیا پھر ہر کوئی سوچنے سمجھنے پر آمادہ کیوں نہیں۔

(2) فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَO (دخان۔58)

ترجمہ: ہم نے اس (قرآن) کو تمہاری زبان میں آسان کر دیا

ہے تاکہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔

(3) قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِي عِوَجٍ۔(زمر۔28)

ترجمہ: یہ قرآن ہے سیدھی اور صاف عربی میں۔

(4) لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ ۝ (فصیح عربی زبان ہے)(نحل۔103)

اس کے علاوہ اس کی ایک حیثیت بین الاقوامی بھی ہے۔اس لحاظ سے دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی صف میں شامل ہے، جو دنیا کی کثیر آبادی میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

عربی زبان کا ارتقاء:

عربی زبان ان سامی زبانوں میں سے ایک ہے جو سب کی سب ایک زمین کی پیداوار ہیں۔ جہاں سے وہ پھوٹ کر بڑھی اور پھیلی ہیں۔جگہ کی تنگی اور گنجان آبادی کی وجہ سے سامی قومیں متفرق مقامات میں بکھر گئیں۔تو ان کی آپس کی جدائی اور دوسروں میں اختلاط کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی زبانوں میں اختلاف پیدا ہونا شروع ہو گیا۔'' ماہرین کے مطابق سامی زبانوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔جس میں آرامی۔ کنعانی اور عربی ہے۔ عربی سے مضر کی فصیح زبان اور دوسرے متفرق قبائل عرب بولتے تھے وجود میں آئیں۔(1)

عربی زبان کی ابتداء کا مسئلہ پیچیدہ ہے۔آج تک ماہرین لسانیات

1) تاریخ ادب عربی ص45۔

اس کا صحیح حل پیش نہیں کر سکے۔ اور نہ ہی اس کے ابتداء کا کوئی صحیح زمانہ متعین ہو سکا ہے۔ تاریخ ادب عربی کے دیباچہ سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے۔ کہ عربی زبان کے ''ام الالسنہ'' ہونے میں شک نہیں۔ اس سلسلے میں ایک ثبوت تو خود عربی زبان کے آغاز کا مسئلہ ہے۔ جو آج تک راز بنا ہوا ہے اور موجودہ علمی تحقیقات اس کا صحیح جواب دینے میں ناکام رہی ہیں۔ پھر قرآن مجید میں ''ام القریٰ'' کا لفظ اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ دنیا کی تاریخ میں انسانی اجتماعیت کا آغاز مکہ سے ہوا۔ اس خیال کو خانہ کعبہ کے لیے ''اول بیت وضع الناس'' سے تقویت پہنچتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جہاں انسان نے سب سے پہلے اجتماعیت پیدا کی اور خدا کی عبادت شروع کی۔ وہاں سب سے پہلے انسان نے زبان بھی بنائی ہوگی۔ لہٰذا ''ام القریٰ'' کی زبان ''ام السنہ'' ہی ہوگی۔ (1)

اس کتاب کے مقدمہ کے حسب ذیل اقتباس سے عربی زبان کی قدامت اور وسعت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ''عربی زبان کا ادب دنیا کی تمام زبانوں کے ادب کے مقابلے میں مالا مال ہے۔ اس لیے اس کا آغاز آفرینش انسان سے ہوتا ہے۔ اور اس کی انتہا۔ عربی تمدن کے مٹ جانے پر ہوگی۔'' (2)

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ مکرمہ کو دنیا کا تبلیغی مرکز ٹھہرایا۔ تو آپ علیہ السلام کے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے مکہ کے ایک عرب

(1) تاریخ ادب عربی ص 8۔
(2) تاریخ ادب عربی ص 35۔

قبیلے بنو جرہم میں شادی کی۔ اور انہیں سے عربی زبان سیکھی۔ لیکن عربی زبان کی تاریخ کا وہ دور ابتدائی اور ارتقائی تھا۔ ازاں بعد جب مکہ مکرمہ کو اپنے محل وقوع اور روحانی مرکز کے لحاظ سے مرکزی حیثیت حاصل ہوئی تو اہل مکہ کی زبان فصیح ہوتی گئی۔ اور اس کا یہ حیرت انگیز ارتقاء مشیت ایزدی کے عین مطابق تھا۔ جس کی وضاحت حسب ذیل اقتباس سے ہوتی ہے:

"عربی زبان اور اس کا مطالعہ کرنے سے یہ بات کھل کر واضح ہوتی ہے۔ کہ اس زبان و ادب پر اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت رہی ہے۔ خدا جب کسی انسان کو نبوت کے لیے چنتا ہے تو اسے ایک خاص انداز اور خاص ماحول میں پروان چڑھاتا ہے۔ اسی طرح جب اس عربی زبان کو اپنے آخری پیغام ہدایت کے لیے انتخاب فرمایا تو اس کو ابتداً ایک خاص انداز سے اپنی نگرانی اور حفاظت میں پروان چڑھایا۔ اور جب اس زبان کا ادب استعداد و صلاحیت کے اس بلند مقام پر پہنچا جہاں وہ وحی خداوندی کا متحمل ہو سکے تو اس میں قرآن مجید نازل فرمایا۔ جو ادب عربی کا اعلیٰ و اکمل نمونہ ہے۔(1)

مکہ کی تجارتی اور روحانی مرکزیت کے پیش نظر مختلف اقوام کے اختلاط سے جو زبان وقوع پذیر ہوئی۔ وہ خالصاً قریش کی زبان تھی۔

(1) تاریخ ادب عربی ص5۔

"قریش مکہ کے باشندے اور وہاں کے رئیس تھے۔ انہیں اپنے تمدن، خانہ کعبہ کی تولیت۔ حج کی قیادت، عکاظ، کے بازار پر حکمرانی۔ جاڑوں میں یمن اور گرمیوں میں شام کے تجارتی سفروں نے تمام عربی قبائل سے ربط وضبط رکھنے اور بخوبی واقف ہونے کا پورا موقع فراہم پہنچا دیا تھا۔ جس کی مدد سے انہوں اپنے لیے ایک پیاری اور نہایت شیریں زبان منتخب کر لی تھی۔ جو الفاظ اور ہجوں کی خامیوں سے پاک صاف اور نہایت درجہ دل نشین ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے مواد کے لحاظ سے بھی زیادہ وسیع تھی۔(1)

ڈاکٹر گستاولی بان زبان عربی کے اس ارتقاء کی بابت لکھتا ہے کہ "ہمیں نہیں معلوم کہ زبان عربی اپنی موجودہ حالت میں کب آئی۔ لیکن شعرائے جاہلیت کے کلام سے اس قدر معلوم ہوتا ہے۔ کہ آنحضرت ﷺ سے اقلاً ایک صدی پہلے یہ زبان درجۂ کمال کو پہنچ چکی تھی اس زبان کے کئی محاورے تھے۔ لیکن روایات کے موجب جن کو مؤرخین اسلام نے قبول کیا ہے۔ کہ آنحضرت ﷺ کے قبیلہ قریش کی زبان نہایت خالص تھی۔ اور قرآن کی اشاعت نے اس خالص زبان کو تمام عالم میں پھیلا دیا۔" (2)

(1) تاریخ ادب عربی ص 49۔

(2) تمدن عرب 488۔

عہد جاہلیت کی شاعری:

شاعری کسی زبان کے ارتقاء اور درجہ کمال کو پہنچانے میں بڑی معاون ہوتی ہے۔ آج بھی ایسی زندہ اور ترقی یافتہ زبانیں موجود ہیں جن کے ابتدا ہی شاعری سے ہوئی شاعری کی صنف کسی زبان کے ادب کا ایک نمایاں پہلو ہوتا ہے۔ جو اس کی فصاحت و بلاغت۔ وسعت و ہمہ گیری کا پتہ دیتا ہے۔ عربی زبان کے ارتقاء میں بھی شاعری نے اہم کردار ادا کیا ہے، اور خصوصاً بعثت نبوی ﷺ سے ایک صدی قبل جو جاہلیت کا دور کہلاتا ہے۔ عربی زبان کے شعری ادب کا بہترین دور ہے۔

> ''آنحضرت ﷺ کی بعثت سے قبل ایک صدی میں عربستان کی شاعری کا اعلیٰ عروج ہوا۔ اس عروج کا نتیجہ یہ تھا کہ شاعروں کی خالص اور صاف زبان تمام ملک میں پھیل گئی۔ اور عربستان کے مختلف محاورات آپس میں مل کر ایک مستقل زبان بن گئی۔'' (1)

عہد جاہلیت میں شاعری کے عروج، عربی زبان کی ہمہ گیری اور وسعت کا یہ عالم تھا کہ جملہ علوم وفنون کو بھی اشعار میں ڈھال کر بیان کرنا اس عہد کے شعراء کے لیے چنداں مشکل نہیں تھا۔ حتیٰ کہ اس وقت کے سائنسی علوم کو بھی اشعار کی زبان میں بیان کیا جاتا تھا۔ کل تمدن عرب کے زمانے میں شاعری کا چرچا رہا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کبھی اس عروج پر پہلے

(1) تمدن عرب ص 485۔

نہ پہنچی۔ جو اس نے جاہلیت کے زمانے میں حاصل کیا تھا۔تمام تعلیم یافتہ لوگ خواہ وہ مدّبرین ملک یا ریاضی دان یا طبیب ہوں سب میں شاعری کا جزو شامل تھا۔ اور یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ دنیا کا تمام منظوم کلام اکیلے عربی منظوم کلام کے برابر ہے۔انہیں نظم کا اس قدر شوق تھا کہ وہ بعض اوقات فقہ، فلسفہ اور جبر و مقابلہ کو بھی نظم میں لکھتے تھے اور ان کے اکثر قصص و حکایات میں نظم ونثر ملی ہوئی ہے۔(1)

سطور بالا میں عربوں کا شاعری کے ساتھ کمال شغف کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس شوق کو پورا کرنے کے لیے وہ اپنے عہد میں اس قسم کی ادبی کانفرنسوں کا اہتمام کرتے تھے۔جن میں مشہور شعراء اپنا کلام سناتے اور داد حاصل کرتے تھے۔ اس ذوق کی تکمیل کے لیے جو اہتمام کیا جاتا تھا ان میں دو میلے خصوصیات کے ساتھ قابل ذکر ہیں جن کا مختلف مقامات پر انعقاد ہوتا تھا۔

"ان میلوں میں قابل ذکر عکاظ مجند اور ذوالمجاز کے میلے ہیں۔ ان میں اوّل الذکر کو عربی زبان کی اصلاح وتہذیب میں برتری حاصل ہے یہ بازار ذلقیعدہ کی پہلی تاریخ کو بھرنا شروع ہوتا اور بیس تاریخ تک لگاتار جاری رہتا تھا۔"(2)

دوسری ادبی کانفرنسوں اور خصوصاً عکاظ کے میلے کے مشاعرہ میں جو کلام سب سے عمدہ ہوتا تھا۔ وہ بیش بہا چیزوں پر سونے کے حرفوں سے لکھ کر

1) تمدن عرب ص 496۔

2) تاریخ ادب عربی ص 48۔

خانہ کعبہ میں آئندہ نسلوں کے لیے لٹکا دیا جاتا تھا۔ عرب شاعری سے ادبی ذوق ہی پورا نہ کرتے تھے۔ بلکہ وہ اپنی پر جوش نظموں سے جذبات کو ابھارتے تھے۔ اور ہجو سے مخالفین کی تضحیک کا سامان پیدا کرتے تھے۔ وہ اپنی نظموں کے ذریعے جب چاہتے جوش مخالفت پیدا کر دیتے تھے۔ اور جس قبیلہ کی چاہتے مدح کرتے اور جس کی چاہتے ہجو کرتے۔ اور اس کے لیے وہ اپنے مال و دولت خرچ کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ ان کی ان کیفیات کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ

> ''مشہور شاعر اعشیٰ کو قریش نے سو اونٹ محض اس لیے دیئے تھے کہ آنحضرت ﷺ کی مدح میں جو شعر اس نے لکھے تھے ان کی اشاعت نہ کرے۔(1)

رسم الخط:

ظہور اسلام سے قبل عربی کا فن تحریر معرض وجود میں آ چکا تھا۔ اور اس کی ابتدا مکہ میں ہوئی تھی۔ کیونکہ مکہ سب سے زیادہ متمدن شہر تھا۔ اور وہاں تعلیم کا خاصا چرچا تھا۔ عربوں نے یہ خط حمیری زبان سے مستعار یا تھا۔ اسی پر نکتے اور اعراب نہیں ہوتے تھے۔ قوم حمیرا کے دریافت شدہ کتابت کی تحریرات اور عہد نبوی ﷺ کی تحریرات میں بہت مماثلت پائی جاتی ہے۔(2)
زمانہ جاہلیت کی کئی تحریروں کا سراغ بھی ملتا ہے۔ ورقہ بن نوفل نے اس عہد

(1) تمدن عرب ص-494
(2) اسلامی تعلیم نومبر دسمبر 1972ء 30-29۔

میں تورات اور انجیل مقدس کو عربی میں منتقل کیا۔ بعض یہود اور نصرانی علماء اور شعرا کے دیوان بھی ضبط تحریر میں آ چکے تھے۔ عکاظ کی تعلیقات کو خانہ کعبہ میں لٹکایا جاتا تھا۔ حضور اکرم ﷺ کے ساتھ قریش کے سوشل بائیکاٹ کا معاہدہ بھی لکھ کر خانہ کعبہ میں لٹکایا گیا تھا۔ اور اس طرح کی کئی اور تحریرات کا سراغ ملتا ہے۔ بعثت نبوی ﷺ کے وقت مکہ میں پڑھے لکھے موجود تھے۔ جن میں سے بعض مسلمان ہو گئے۔ اسلامی ریاست مدینہ کے آغاز کے وقت ہی حضور اکرم ﷺ نے تعلیم کی طرف توجہ فرمائی۔ اس میں تحریر کو خصوصیت حاصل تھی۔ عرب میں لکھنے پڑھنے کا رواج بہت کم تھا۔ جب اسلام آیا تو گویا تحریر یا کتابت کا فن بھی ساتھ لے کر آیا۔ سب سے بڑی ضرورت قرآن کے ضبط و تدوین کی تھی۔ اسی بناء آنحضرت ﷺ نے شروع ہی سے کتابت کی طرف توجہ فرمائی جنگ بدر کے ذکر میں گزر چکا ہے۔ کہ اسیران میں سے جو فدیہ ادا نہ کر سکے۔ ان کو اس شرط پر رہا کیا گیا کہ وہ مدینہ میں رہ کر لوگوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔(1)

اس طرح مدنی زندگی میں تعلیم و تدریس کا جو اہتمام کیا گیا اس میں فن کتابت اور تحریر کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ جیسا کہ سیرت النبی ﷺ میں علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ اصحاب صفہ کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ کہ اصحاب صفہ کو جو تعلیم دی جاتی تھی۔ اس میں لکھنا بھی شامل تھا۔ چنانچہ عبادہ

1) سیرت النبی ﷺ جلد دوم ص 91۔

بن صامت رضی اللہ عنہما قرآن کے ساتھ لکھنے کی تعلیم بھی دیتے رہتے تھے۔(1)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد حکومت میں حکومتی سطح پر مختلف سفارتی۔تبلیغی خطوط اور معاہدات جنگ وصلح کی تحریرات سے واضح ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فن کی طرف خاص توجہ فرمائی۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کے تبلیغی خطوط جو مختلف بادشاہوں کے نام لکھے گئے ان کا طرز تحریر اور موجودہ عہد کے عربی رسم الخط میں کافی فرق ہے۔"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے اس وقت تک زبان میں بہت تھوڑا فرق ہوا ہے۔لیکن خط میں بڑی تبدیلی آ گئی ہے۔پہلا خط جس کو اس وجہ سے کوفی کہتے تھے کہ کوفہ میں ایجاد ہوا نہایت مشکل تھا۔کیونکہ اس میں اعراب نہیں تھے۔آٹھویں صدی عیسوی میں یہ خط تبدیل کیا گیا۔اور اس میں اعراب لگائے گئے۔اس کے بعد بھی کتبوں میں کوفی خط جاری رہا۔(2)

اب تک عربی زبان کے ارتقاء شاعری اور رسم الخط کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔جس کا حاصل کلام یہ ہے کہ عربی زبان کا آغاز آفرینش انسان سے ہے اور اس زبان کے ارتقاء کا نقطہ عروج جاہلیت کا وہ دور ہے جو بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تک پھیلا ہوا ہے۔عربی زبان کے اس حیرت انگیز ارتقاء میں مشیت ایزدی کا بڑا دخل ہے کیونکہ اسلام کے جس انقلابی پیغام کو دنیا میں پھیلانا مقصود تھا۔اس کے لیے ایک ترقی یافتہ اور عالمگیر خوبیوں کی حامل زبان کی ضرورت تھی۔خداوند کریم نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قبیلہ قریش کی زبان کو یہ شرف بخشا۔

(1) سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم جلد دوم ص 91۔

(2) سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم جلد دوم ص 91۔

(4) عہد نبوی ﷺ کا تحریری سرمایہ:

گزشتہ صفحات میں عربی زبان اور اس کے رسم الخط کا جائزہ لیتے ہوئے زمانہ جاہلیت کی بعض تحریروں جن میں ورقہ بن نوفل کا تورات اور انجیل کا عربی زبان میں منتقل کرنا۔ یہودی اور نصرانی علماء اور شعراء کی دیوان اور عکاظ کی تعلیقات کا ذکر کیا گیا ہے۔ بعثت نبوی ﷺ کے وقت خود رسول اللہ ﷺ کے ساتھ قریش نے جو مقاطعہ (SOCIAL BOYCOT) کیا تھا اس کا معاہدہ بھی لکھ کر خانہ کعبہ میں لٹکایا گیا تھا اور اسی طرح اس عہد میں کئی اور تحریرات کا بھی سراغ ملتا ہے۔ ان سے قطع نظر رسول اللہ ﷺ نے جس تعلیمی انقلاب کی بنیاد رکھی تھی اس کے پروگرام میں اور نصاب میں خوشنویسی کو بھی شامل کیا گیا تھا۔ جس کے نتیجہ میں کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فن تحریر سے واقف ہو گئے تھے۔ اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں آپ ﷺ کے اقوال و واقعات کو ضبط تحریر میں لانا شروع کر دیا تھا۔ اگر چہ یہ اس عہد کی ابتدائی کوشش تھی۔ تاہم مستقبل میں اسلامی تعلیمات (روایت وحدیث) کو تحقیق و تدقیق کے بعد قلم بند کرنے کی جو تحریک چلی اس میں یہ تحریری سرمایہ بہت حد تک کار آمد ثابت ہوا۔ عہد نبوی ﷺ میں ضبط تحریر میں آنے والے واقعات۔ معاہدات۔ دعوتی خطوط اور شرعی احکام شامل ہیں۔ جن کا کتب سیر و حدیث سے پتہ چلتا ہے۔ ان میں سے چند ایک کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(1) فتح مکہ کے موقع پر آپ ﷺ نے ایک خطبہ دیا تھا۔ صحیح بخاری میں ہے۔ کہ ابوشاہ نامی رضی اللہ عنہ ایک یمنی صحابی کی درخواست پر آپ ﷺ نے

یہ خطبہ لکھ کر ان کے حوالے کرنے کا حکم دیا۔ (صحیح بخاری کتاب العلم)

(2) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سلاطین عالم کے نام جو دعوتی خطوط روانہ کیے تھے۔ وہ لکھے ہوئے تھے۔ جن کی نقول کتب سیر و حدیث میں موجود ہیں۔ اور بعض خطوط اصلی (ORIGINAL) حالت میں دریافت ہوئے ہیں۔

(3) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ کہ عبداللہ بن عمر بن العاص رضی اللہ عنہما کے سوا مجھ سے زیادہ کسی کو حدیث یاد نہیں۔ مجھ سے زیادہ ان کے پاس حدیثوں کا سرمایہ ہونے کی وجہ یہ ہے۔ کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنتے اس کو لکھتے جاتے تھے اور میں لکھتا نہ تھا۔ (بخاری۔ کتاب العلم)(1)

(4) عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر اقوال کا ایک مجموعہ تیار کر رکھا تھا۔ جس کو وہ "صادقہ" کہتے تھے۔ اور کہا کرتے تھے۔ کہ "مجھے اپنی زندگی کی آرزو صرف دو چیزوں نے پیدا کر دی ہے۔ جن میں ایک "صادقہ" ہے۔ "صادقہ" صحیفہ ہے جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر لکھا ہے۔ (دارمی)(2)

(5) صحیح بخاری میں ہے۔ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ جانے کے کچھ عرصہ بعد مسلمانوں کی مردم شماری کرائی۔ اور ان کے نام لکھوائے تو پندرہ سو ہوئے۔ (بخاری باب الجہاد)

(6) زکوٰۃ کے احکام و مختلف چیزوں پر زکوٰۃ اور اس زکوٰۃ کی مختلف شرحیں جو پورے دو صفحوں میں ہیں۔ ان کو لکھوا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امراء کو بھیجیں اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس ابوبکر بن عمرو بن حزم کے خاندان میں اور متعدد اشخاص کے پاس موجود تھیں۔ (دارقطنی۔ کتاب زکوٰۃ)(3)

(7) حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس ایک صحیفہ تھا۔ جوان کی تلوار کی نیام میں پڑا رہتا تھا اس میں متعدد حدیثیں اور احکام قلمبند تھے۔ اور انہوں نے اس کو لوگوں کی درخواست پر دکھایا۔ (صحیح بخاری)(4)

(8) صلح حدیبیہ میں جو صلح نامہ آنحضرت ﷺ اور قریش مکہ کے درمیان حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لکھا تھا۔ اس کی ایک نقل قریش نے لی۔ اور ایک آنحضرت ﷺ نے اپنے پاس رکھی۔

(9) عمرو بن حزم رضی اللہ عنہما کو رسول اللہ ﷺ نے یمن کا حاکم بنا کر بھیجا تو ایک تحریر لکھوا کر حوالہ کی جس میں فرائض۔ صدقات، دیات وغیرہ کے متعلق بہت سی ہدایات تھیں۔ (کنز العمال)(6)

(10) وائل بن حجر صحابی رضی اللہ عنہما جب بارگاہ نبوی ﷺ سے اپنے وطن حضر موت جانے لگے تو آنحضرت ﷺ نے ان کو خاص طور پر ایک نامہ لکھوا کر دیا۔ جس میں نماز، روزہ۔ ربو۔ شراب اور دیگر احکام تھے۔ (طبرانی)(7)

(11) حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فتاویٰ کا بڑا حصہ لکھا ہوا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی خدمت میں لایا گیا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس روائیتوں کے مختلف تحریری مجموعے تھے اہل طائف میں سے کچھ لوگ ان کا ایک مجموعہ ان کو پڑھ کر سنانے کے لیے لے آئے۔ (ترمذی)(8)

(12) سنن ابوداؤد میں ہے۔ کہ حضور ﷺ نے اپنی حیات مبارکہ میں وہ تمام حدیثیں جن کا تعلق مسائل زکوۃ سے تھا۔ یکجا قلمبند کروا دیں۔ جن کا نام کتاب الصدقہ تھا۔ مگر اس کو اعمال واحکام کے پاس روانہ کرنے سے قبل ہی آپ ﷺ کا وصال ہو گیا۔ تو خلفائے راشدین

میں سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں اسے نافذ کیا۔ اس کے مطابق زکوٰۃ کے وصول و تحصیل کا ہمیشہ انتظام رکھا۔ (ابوداؤد کتاب زکوٰۃ)(9)

(13) ضحاک بن سفیان اصحابی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریر کرائی ہوئی ایک ہدایت جس میں شوہر کی دیت کا حکم تھا۔ (دار قطنی)(10)

(14) حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما کو ایک تحریر یمن بھیجی گئی۔ جس میں سبزیوں، ترکاریوں پر زکوٰۃ نہ ہونے کا حکم تھا۔ (دار قطنی)(11)

(15) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما نے ایک مجموعہ لکھا تھا۔ جو ان کے صاحبزادے کے پاس تھا۔ (جامع بیان العلم) (12)

(16) حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہما نے ایک مجموعہ حدیث مرتب کیا۔ اس کا نام کتاب ''سعد بن عبادہ'' تھا۔ جو کئی پشت تک ان کے خاندان میں رہا۔ (مسند احمد)(13)

الغرض ایسی کئی اور مثالیں بھی جمع کی جا سکتی ہیں۔ جن کا تعلق خاص عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے تھا۔ اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اور بعض آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے تحت ضبط تحریر میں لائی گئیں۔

(1) تا (13) کے حوالہ کے لیے (1) فیوض الباری فی شرح صحیح بخاری کے صفحات 304,22,21 اور (۲) خطبات مدراس، کے صفحات 50 تا 53 کا اختصار پیش کیا گیا ہے۔

استفادہ

از کتب

(1) القرآن

(2) امجد علی، مولینا انتخاب صحاح ستہ" محمد سعید اینڈ سنز۔ قرآن محل بالمقابل مولوی مسافر خانہ کراچی۔

(3) خان افضل حسین رحمۃ اللہ علیہ فن تعلیم و تربیت، اسلامک پبلکیشنز۔ شاہ عالم مارکیٹ لاہور۔

(4) رضوی۔ سید محمود احمد "فیوض الباری فی شرح صحیح بخاری۔ مکتبہ رضوان اندورن دہلی دروازہ لاہور۔

(5) زیات۔ احمد حسن "تاریخ ادب عربی" (ترجمہ عبدالرحمن طاہر سورتی) شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور 1961ء

(6) زبیری۔ محمد امین "مسلم خواتین کی تعلیم" (طبع ثانی) اکیڈیمی آف ایجوکیشن ریسرچ۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی۔ 1961ء۔

(7) شبلی نعمانی۔ علامہ "سیرت النبی ﷺ" جلد دوم۔ محمد سعید اینڈ سنز تاجران کتاب قرآن محل کراچی نمبر 1۔

(8) عبدالرسول۔ صاحبزادہ "تاریخ اسلام" ایم۔ آر برادرز اردو بازار لاہور۔

(9) غلام رسول۔ پروفیسر (اسلام معاشرتی، سیاسی، اور معاشی نظریات) علمی کتب خانہ۔ اردو بازار لاہور۔ 1971ء

(10) قریشی۔ محمد مختار۔ ''تاریخ التعلیم'' پنجاب کتاب گھر اردو بازار لاہور۔

(11) کاندھلوی۔ محمد یوسف ''حیات صحابہ رضی اللہ عنہم'' (ترجمہ۔ محمد عثمان خاں) ایم۔ ایچ سعید اینڈ کمپنی ادب منزل پاکستان چوک کراچی۔ 1972ء

(12) گستاؤلی بان، ڈاکٹر ''تمدن عرب'' (ترجمہ سید علی بلگرامی) ملک مقبول احمد مالک مقبول اکیڈیمی۔ لاہور۔

(13) محمد سعید خلیفہ ''سیرۃ النبیؐ پر ایک محققانہ نظر'' جلد دوم۔ دار تصنیف و النشر جامعہ صدیقہ عالیہ آلومہار شریف ضلع سیالکوٹ۔

(14) محمد حمید اللہ ڈاکٹر ''عہد نبوی ﷺ میں نظام تعلیم''، شمس الاسلام پریس حیدر آباد دکن ۱۳۶۱ھ

(15) مودودی ابو الاعلیٰ ''تفہیم القرآن (جلد چہارم) ادارہ ترجمان القرآن۔ لاہور

(16) مودودی ابوالاعلیٰ ''اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی'' اسلامک پبلیکیشنز لمٹیڈ لاہور۔ ۱۹۶۲۔

(17) مودودی ابو الاعلیٰ ''اسلامی ریاست اور اس کے اصول و مبادی'' اسلامک پبلیکیشنز لمٹیڈ لاہور۔ ۱۹۶۲۔

(18) منصور پوری قاضی محمد سلیمان ''رحمۃ العالمین'' جلد سوم۔ شیخ غلام علی

اینڈ سنز کشمیری بازار لاہور۔

(19) ندوی۔سید سلیمان ''سیرۃ النبی'' جلد چہارم در مطبع معارف شاہ اہ اعظم گڑھ ۱۹۵۹ء

(20) ندوی سید سلیمان ''خطباتِ مدارس'' اظہار سنز ۱۹، اُردو بازار لاہور ۱۹۷۶ء

(21) الازہری، پیر محمد کرم شاہ، ''ضیاء النبی ﷺ'' گنج بخش روڈ۔لاہور

(22) ناصر ڈاکٹر نصیر احمد ''پیغمبر اعظم وآخر'' فیروز سنز لمٹیڈ لاہور۔

(23) ندوی مولانا سید ابوالحسن۔ ''نبی رحمت'' مجلس اسلام 3-k ناظم آباد کراچی

(24) مبارک پوری۔مولانا صفی الرحمٰن ''الرحیق المختوم'' مکتبہ سلفیہ شیش محل روڈ لاہور۔

رسائل

(25) ''اسلامی تعلیم'' شمارہ ستمبر اکتوبر ۱۹۷۲ء آل پاکستان ایجوکیشنل کانگرس۔لاہور

(26) ''الجامعہ'' شمارہ جون ۱۹۷۳ء شعبہ نشر واشاعت جامعہ محمدی شریف ضلع جھنگ۔

(27) ''ترجمان اہل سنت'' ربیع الاول ۱۳۹۷ھ (مارچ ۱۹۷۷ء) ۲۷۔محمد مینشن مارسٹن روڈ کراچی۔

(28) ''محدث'' ربیع الاول ۱۳۹۷ھ۔ مجلس تحقیق الاسلامی گارڈن ٹاؤن لاہور۔

(29) ''فکرونظر'' سیرت نمبر شمارہ مارچ ۱۹۷۶ء ادارہ تحقیقاتِ اسلامی اسلام آباد۔

(30) ماہنامہ نقوش رسول نمبر۔ جلد پنجم۔ لاہور۔

غیر مطبوعہ مقالے

(31) عبدالرحیم۔ وغیرہ ''اسلام اور تعلیم عوام'' ادارہ تعلیم و تحقیق جامعہ پنجاب لاہور۔

(32) محمدؐ دین وغیرہ ''عہد رسالت کا نظام تعلیم'' ادارہ تعلیم و تحقیق جامعہ پنجاب لاہور۔

اخبار

(33) ''نوائے وقت'' ۱۴ مارچ ۱۹۷۶ء شاہراہ قائد اعظمؒ لاہور۔



نورانیت و حاکمیت
مقدس فریب
اخبار الاخیار
زبدۃ التحقیق
زاویہ پبلشرز
دربار مارکیٹ لاہور
Voice: 042-37248657
Mobile: 0300-9467047